محمد علی جناح



از

کانجی دوارکاداس

محمدؐ علی جناح

از

کانجی دوارکا داس

ترجمہ اور ترتیب

سید شہاب الدین دسنوی

ناشر

علمی مجلس دلّی

سلسلۂ مطبوعات علمی مجلس — ۲۱

پہلی اشاعت : [illegible]

کتابت : خلیق ٹونکی

طباعت : کوہِ نور پرنٹنگ پریس، لال کنواں، دہلی-۶

قیمت : چار روپے پچاس پیسے

محمد علی جناح

فہرستِ مضامین

پیش لفظ

برصغیر ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان، دو آزاد مملکتوں کے وجود میں آنے کی کئی رُودادیں انگریزی اور اُردو میں لکھی جاچکی ہیں اور نہ جانے اور کتنی لکھی جائیں گی۔ اس سیاسی ڈرامے کے کچھ ناظرین ابھی زندہ ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جنھوں نے اس میں خود بھی چھوٹا بڑا پارٹ ادا کیا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے سارا ڈراما تنقیدی نظروں سے دیکھا ہے۔ ان لوگوں کے قلم سے نکلی ہوئی داستانیں، سیاسی شخصیتوں کے سوانح نگاری کے لیے نہیں بلکہ ایک مورخ کے لیے بھی بیش قیمت دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں میں ایک دلچسپ اور اہم داستان کانجی دوارکا داس کی لکھی ہوئی "ہندوستان کی جنگِ آزادی"[1] ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۶ میں شائع ہوئی اس پر برطانیہ کے سابق وزیر اعظم لارڈ ایٹلی نے مقدمہ لکھا ہے۔ اسی موضوع سے متعلق مصنف کی دوسری کتاب[2] ۱۹۶۸ میں شائع ہوئی۔ پہلی کتاب میں ۱۹۱۳ سے ۱۹۳۷ تک اور دوسری میں سن ۱۹۳۷ سے ۱۹۴۷ تک کے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔

میں نے پہلی کتاب پڑھنی شروع کی تو اس وقت اس کے مصنف ــــــ

---

[1] INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM: Popular Prakashan

[2] TEN YEARS TO FREEDOM: Popular Prakashan

کانجی دوارکا داس اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے گہرے ذاتی تعلقات کا مجھے علم نہ تھا۔ کانجی دوارکا داس' قائدِ اعظم کے نہایت عزیز دوست تھے۔ انھوں نے قائدِ اعظم کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اس لیے جو باتیں انھوں نے لکھی ہیں ان میں سے' بہت سے لوگوں کے لیے، بعض باتیں بالکل نئی ہوں گی۔ اسی بنا پر مجھے خیال آیا کہ اگر اُن ساری باتوں کو جو قائدِ اعظم کے بارے میں ان دو کتابوں کے صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں' یکجا کر کے مرتب کر لیا جائے تو قائدِ اعظم کی شخصیت کے کچھ نئے' زاویے سامنے آجائیں گے اور یہ مواد مستقبل کے سوانح نگار کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ مصنف سے ملاقات کر کے میں نے یہ خیال اُن کے سامنے پیش کیا۔ وہ خوش ہوئے اور ترجمہ اور ترتیب' دونوں کی اجازت دے دی۔ اُس وقت تک اُن کی دوسری کتاب شائع نہیں ہوئی تھی' اس کے باوجود انھوں نے اُس کا مسودہ میرے حوالے کر دیا تاکہ میں اُس میں سے بھی مواد حاصل کر سکوں۔

کانجی دوارکا داس نے قائدِ اعظم اور مہاتما گاندھی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے کچھ حصّوں سے بعض لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ایک تبصرہ نگار کا کہنا ہے: "ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ماضیِ قریب کا جائزہ، "تاریخی انداز اور تنقیدی شعور کے ساتھ لیا کریں یعنی واقعات کو واقعات کی شکل میں پیش کریں۔ اس لحاظ سے مصنف نے دیانت داری اور بے باکی سے کام لیا ہے۔" خود مصنف کا کہنا ہے: "میں ہر بات صاف صاف لکھتا ہوں، نہ کسی کو خوش کرنے کی خاطر نہ کسی کو ناراض کرنے کے لیے۔" اپنی کتابوں کے لیے مصنف کو وہ یادداشتیں اور نوٹ بہت کام آئے جو وہ اپنی عادت کے مطابق ہر ہفتہ لکھتے رہے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے مجھے بتایا اُن کے

پاس ایسے کاغذات کی تقریباً تین سو فائلیں تھیں جو اُنھوں نے امریکہ کی پن سلوینیا یونی ورسٹی کے کتب خانے کو دے دی ہیں۔

کانجی دوارکا داس مشہور سوشل ورکر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے قومی معاملات میں بھی گہری دلچسپی لی ہے۔ ان کی کوششوں سے بمبئی اسمبلی میں مزدوروں کی فلاح اور پیشہ ور عورتوں، بے گھر اور آوارہ گرد بچوں کی بہبودی کی خاطر کئی قانون منظور ہوئے۔ سن ۱۹۲۱ سے ۱۹۲۳ تک وہ بمبئی لیجس لیٹو کونسل کے رکن اور ۱۹۱۷ سے ۱۹۱۹ تک آل انڈیا ہوم رول لیگ کے جنرل سکریٹری اور خازن رہے۔ پھر ۱۹۱۹ سے ۱۹۳۳ تک نیشنل ہوم رول لیگ کے بانی اور جنرل سکریٹری رہے۔ وہ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے بانیوں میں ہیں۔ سن ۱۹۳۲ سے ۱۹۳۵ تک بمبئی میونسپل کارپوریشن کے ممبر اور ۱۹۵۶ سے ۱۹۶۰ تک بمبئی ہاؤسنگ بورڈ کے رکن تھے۔ رفاہِ اطفال کے کئی اداروں سے بھی متعلق رہے۔

کانجی دوارکا داس نے یورپ، امریکہ اور مشرقی افریقہ کے سفر کئے، اُن ملکوں میں مختلف مقامات پر تقریریں کیں۔ ان کے مضامین مؤقر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی پیدائش یکم مئی ۱۸۹۲ کی ہے۔

تاریخ یوں تو حادثات ہی سے بنتی ہے لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے۔ جب کبھی اس ملک کی سیاست نے موڑ لیا تو ہمیشہ ایسے مقام پر جہاں سے دو راستے نکلتے تھے۔ جو راہ چھوٹ گئی اگر وہ اختیار کرلی جاتی تو ملک کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا مطالعہ کرنے والوں کو اس حقیقت کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے۔ اس کتاب میں بھی مسلم لیگ، کانگریس، ہوم رول لیگ، گاندھی، جناح، پٹیل اور نہرو کے ذکر میں بار بار "کاش ایسا ہوتا" یا "کاش یہ نہ ہوتا" کی آواز اُٹھتی ہے اور یہ آواز

بڑی بامعنی ہو جاتی ہے۔

کانجی دوارکا داس نے اپنی کتابوں میں "قائدِ اعظم" کو صرف "جناح" لکھا ہے۔ انگریزی رواج کے علاوہ اُن کو ایسا لکھنے کا حق بھی پہنچتا ہے۔ ترجمے میں بھی اس بے تکلف طریقۂ تخاطب کو برقرار رکھا گیا ہے۔

میں کانجی دوارکا داس کا بے حد ممنون ہوں اور خلوصِ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ترجمے اور نئی ترتیب کی اجازت دی۔ چونکہ اس کتاب کا مضمون شروع سے اخیر تک اُنھیں کا ہے اس لیے کتاب پر مصنف کی حیثیت سے اُنھیں کا نام درج ہے، البتہ حاشیے میں جہاں مترجم نے اضافے کیے ہیں وہاں "م" لکھ دیا گیا ہے اور جہاں "م" نہیں لکھا گیا اُس عبارت کی بات مصنف سے ملاقات کے دوران میں اُن کی زبانی معلوم ہوئی۔

بمبئی

سید شہاب الدین دسنوی

۱۹ ستمبر ۱۹۶۹

جس سن میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تھی اُسی سال دسمبر میں " بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن " کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جون ۱۹۱۶ میں اس ایسوسی ایشن کا ایک جلسہ ہو رہا تھا جس میں حاضرین کی کل تعداد پچیس تھی۔ دو تین تقریریں ہو چکیں تو چھریرے بدن کا ایک مُقرر کھڑا ہوا۔ چیک ڈیزائن کی پتلون اور سیاہ رنگ کا کوٹ پہنے، ایک طرف کو مانگ نکلی ہوئی، چہرے پر مونچھیں —— جب تک یہ شخص بولتا رہا، سب ہمہ تن گوش ہو کر اُس کا ایک ایک لفظ سُنتے رہے۔ اُس کے اندازِ بیان میں خوش مزاجی تھی، لہجہ صلح کُن تھا؛ مسئلے کو مختلف زاویوں سے پیش کر کے وہ درمیانی راہ نکالتا جاتا تھا۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگا یہ شخص کون ہے؟ پی۔ کے۔ تیلنگ میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا۔ وہ تعجب سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے: "تم جناح کو نہیں جانتے؟" میں نے جناح کا نام تو سنا تھا لیکن دیکھا کبھی نہ تھا۔ اُن کی عمر اُس وقت ۴۳ سال تھی اور بمبئی کے قانونی حلقے میں نام پیدا کر چکے تھے۔ اُن کی جرح اور بحث، دونوں کی دھوم مچی تھی۔ اس کے سوا وہ مرکزی اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے بھی کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ سیاسی دنیا میں وہ مسز سروجنی نائیڈو کے دیئے ہوئے خطاب "ہندو مسلم اتحاد کی علامت" سے پہچانے جاتے تھے۔ اور بعض لوگ انھیں "مسلمانوں کے گوکھلے" بھی کہا کرتے تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو "گاندھی یگ" شروع ہونے سے بہت پہلے، یعنی ۱۹۱۶ میں، جناح اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔

تعارف

جلسہ ختم ہوا تو تیلنگ نے اُن سے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا کہ میں مسز اینی بیسنٹ کی تھیاسوفی تحریک سے وابستہ ہوں اور سیاست میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ جناح نے بڑے دِلاویز انداز سے مُسکراتے ہوئے، دوستانہ لہجے میں مشورہ دیا کہ اگر سیاست میں حصّہ لینا ہو تو مجھے پورے انہماک اور خلوص کے ساتھ اس میں کام کرنا چاہیے۔ نصیحت کے اِس فقرے کے ساتھ جناح سے میری دوستی کا آغاز ہوا۔ اُس وقت میری عمر صرف ۲۴ سال تھی، ہماری یہ دوستی ستمبر ۱۹۴۸ء تک جاری رہی جب کہ وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے!

رومان اور شادی

جس جلسے کا میں نے ذکر کیا اس میں جناح غیر معمولی طور پر مسرور نظر آرہے تھے۔ اس مسرّت کا سبب بعد کو یہ معلوم ہوا کہ وہ گرمی کی دو مہینوں کی چھٹیاں دارجلنگ میں سر ڈنشا پیٹٹ اور لیڈی پیٹٹ کے ساتھ گزار کر لوٹے تھے اور وہیں اپنے میزبان کی سولہ سال عمر کی بیٹی، رتی کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ جناح کی واپسی پر یہ بات بمبئی میں مشہور ہو گئی ــــ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن لڑکی کے والدین رضامند نہ تھے۔ رتی اُس عمر کو نہیں پہنچی تھی کہ قانونی طور پر اپنی مرضی سے بیاہ کر لیتی۔ وَلی کی حیثیت سے اس کے والدین نے ہائی کورٹ سے ایک امتناعی حکم بھی حاصل کر لیا تھا جس کی رُو سے جناح اور رتی کا ملنا ممنوع تھا۔ ایسی صورت میں ان کو انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جس روز رتی کی عمر ۱۸ سال ہوئی، اُسی دن اُس نے اپنے والدین کے گھر کو خیرباد کہا، اسلام قبول کر لیا اور اُس

کے بعد جناح سے اس کا نکاح ہوگیا۔ اُن دنوں سِوِل میریج کے قانون کے تحت یہ ضروری تھا کہ فریقین پہلے یہ اقرار کریں کہ وہ کسی مذہب کے پیرو نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور قابلِ لحاظ تھی —— جناح مرکزی اسمبلی کی ایک "مسلم نشست" کے ممبر بھی تھے۔

ابتدائی زندگی

جناح ایک غریب گھرانے میں ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کے تھے کہ ان کا بیاہ ایک کمسن لڑکی سے کردیا گیا جس کے فوراً بعد ہی ۱۸۹۲ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہ انگلستان روانہ ہوگئے۔ لندن میں وہ اکثر پارلیمنٹ کی کارروائی سُننے چلے جاتے تھے۔ سن ۱۸۹۶ میں بیس سال کی عمر میں بیرسٹر بن کر کراچی لوٹے لیکن کچھ دنوں بعد بمبئی چلے آئے۔ یہاں اُنھیں مقدموں کے لیے تین سال اور انتظار کرنا پڑا۔ سن ۱۹۰۰ میں وہ عارضی طور پر پریسیڈنسی مجسٹریٹ مقرر کیے گئے۔ اب انھوں نے اپنی چھوٹی بہن، فاطمہ کو بھی بمبئی بلالیا اور باندرہ[1] کے ایک کونونٹ اسکول میں داخل کرادیا۔ جماعت کی طرف سے اِس کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن انھوں نے پروا نہ کی۔ ہر اتوار کو گھوڑے پر بیٹھ کر جناح اپنی بہن کو ملنے باندرہ جایا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انھیں مستقل پریسیڈنسی مجسٹریٹی کا پیشکش کیا گیا تو انھوں نے اُسے قبول کرنے سے انکار کردیا کیونکہ وہ کسی سرکاری ملازمت سے ہمیشہ کے لیے وابستہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ اُنھیں اپنی صلاحیتوں پر اعتماد اور کامیابی کا یقین تھا۔

---

[1] مضافاتِ بمبئی کا ایک مقام۔ م۔

وہ ایک ہزار روپے ماہانہ پر بمبئی میونسپل کارپوریشن کے قانونی مشیر بھی رہے۔

کردار کی خصوصیات

جناح کی بے مثال ایمانداری کا ہر شخص معترف تھا اور ان کی اس نیک نامی کی شہرت اخیر وقت تک قائم رہی۔ اُن کی غیر معمولی ذہانت سے انھیں اپنے قانونی پیشے کے علاوہ سیاسی زندگی میں بھی بے حد مدد ملی۔ اُن کا ذہن مسائل کو صاف اور واضح ڈھنگ سے سوچتا جاتا تھا؛ اُن کی طبیعت انصاف پسند تھی۔ اپنے مخالفوں سے مقابلہ کرنے میں اُن کی یہ دونوں خصوصیتیں بہت کام آئیں۔ سیاست کے میدان میں جہاں وہ گاندھی جی کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کا سدِّباب کر سکے تو دوسری طرف جواہرلال نہرو کی سیماب مزاجی پر بھی قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔

وفد کی نمائندگی

سن ۱۹۰۴ میں کانگریس کے اجلاس میں ایک تجویز منظور کی گئی کہ ہندوستان کے بارے میں برطانوی رائے عامّہ کو ہموار کرنے کی خاطر ایک وفد انگلستان روانہ کیا جائے۔ سر ولیم ویڈربرن نے جو انگلستان سے خاص طور پر کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے آئے تھے، اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے وفد کی کامیابی کی تمنا کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی کہ اس کی قیادت سر فیروز شاہ مہتا کریں۔ لیکن وہ نہ جا سکے اور فیصلہ ہوا کہ ہندوستانی وفد میں بمبئی کی نمائندگی گوکھلے اور جناح کریں۔

سخت مزاجی

جناح پر کبھی یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ دُرشت مزاج واقع ہوئے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ظاہرا سخت مزاجی

اُن کی بے پناہ ایمانداری اور کھری طبیعت کا نتیجہ تھی۔ سر چمن لال سیتلواد اپنی کتاب[1] میں لکھتے ہیں :

"وکالت کے پیشے میں جناح ۱۸۹۵ء میں داخل ہوئے۔ میں اُس زمانے میں مرافعے کے مقدمے لیا کرتا تھا، لیکن جب میں اوریجنل سائڈ پر آیا تو اُن سے زیادہ قرب پیدا ہوا۔ پھر تو کئی مقدموں میں اُن کے ساتھ بھی کام کیا اور اُن کا آمنا سامنا بھی ہوا۔ جناح نے ابتدا ہی سے اپنی بے باکی قائم رکھی تھی۔ وہ کسی بڑے سے بڑے جج یا حریف بیرسٹر سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار اسٹرینگمین[2] اور جناح ایک مقدمے میں ساتھ پیروی کر رہے تھے۔ جناح مشورے کے لیے اسٹرینگ مین کے چیمبر میں گئے تو اس ملاقات کے دوران میں اسٹرینگ مین نے کچھ اس طرح گفتگو کی جس سے جناح کی ہتک ہوتی تھی۔ پھر اس کے بعد جناح، اسٹرینگ مین کے چیمبر میں کبھی نہیں گئے۔

"مجھے عدالت کا ایک اور واقعہ یاد ہے۔ مرحوم جسٹس برزا کے اجلاس پر جناح اور میں فریقین کی جانب سے کام کر رہے تھے۔ اُس مقدمے کے سلسلے میں کئی دوسرے وکلا بھی حاضر تھے۔ بحث کے دوران میں جناح نے جج کو کچھ ایسے انداز سے مخاطب کیا کہ اُسے بُرا لگا۔ جج نے جناح کو متنبہ کیا کہ وہ توہینِ عدالت کے

---

[1] Recollections & Reflections

[2] اُس زمانے کا مشہور انگریز بیرسٹر۔ م

مرتکب ہو رہے ہیں پھر جسٹس مرزا نے مجھ سے پوچھا "کیا مسٹر جناح عدالت کی توہین نہیں کر رہے ہیں ؟" یہ بڑا احمقانہ سوال تھا میں نے جواب دیا اس کا فیصلہ کرنا تو آپ کا کام ہے، میں کیسے کوئی رائے دے سکتا ہوں - لیکن مسٹر جناح کو تھوڑا بہت جانتا ہوں اور اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں وہ ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے ہیں - اس واقعے کے بعد ایک مدت تک جناح نے جسٹس مرزا کے اجلاس پر کام نہیں کیا۔"

سر چمن لال سیتلواد آگے چل کر لکھتے ہیں :

"پبلک لائف میں جناح سے میں بہت قریب ہوگیا تھا۔ برسوں ہم لوگ کانگریس میں ایک ساتھ کام کرتے رہے۔ سائمن کمیشن کے خلاف بمبئی میں ہم دونوں نے مل کر تحریک میں حصہ لیا تھا۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل، انڈین لیجسلیٹو کونسل اور گول میز کانفرنس میں بھی ہم ساتھ رہے۔ ہمارے ذاتی تعلقات ہمیشہ بڑے خوشگوار رہے۔"

سروجنی نائیڈو

مسز سروجنی نائیڈو پہلی بار جناح سے اُس وقت ملیں جب کہ بیرسٹری کے پیشے میں کامیابی جناح کے قدم چوم رہی تھی۔ وہ لکھتی ہیں:

"کسی اور شخص کے ظاہری اور باطنی خصوصیات میں اتنا بڑا تضاد نہیں دیکھا گیا جتنا محمد علی جناح کی شخصیت میں تھا۔ بلند قامت، نازک، چھریرا جسم اُن کے جُثّے کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کے اندر کتنا غیر معمولی جذبہ اور کس بلا کا عزم پوشیدہ ہے۔ بظاہر آئین اور دستور کے پابند اور سختی سے اُن پر کاربند، ایک

حد تک الگ تھلگ، سنجیدہ اور شائستہ — مگر جو لوگ اُن سے واقف تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جناح کے سینے میں عورت کے دل کی نرمی اور بچّے کی معصومی پوشیدہ ہے؛ وہ ایک عملی اور عقلیت پسند آدمی تھے۔

کانگریس کے جلسے میں دسمبر ۱۹۰۶ میں جناح پہلی بار کلکتہ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اُس وقت وہ دادا بھائی نوروزجی، صدر کانگریس کے پرائیوٹ سکریٹری تھے۔ اِس موقع پر خطبۂ صدارت میں "سیلف گورنمنٹ" یا "سوراج" کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔

تفریحی مشغلے جناح بمبئی اورینٹ کلب کے ممبر تھے اور وہاں بلیرڈ یا شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شطرنج اچھی کھیل لیا کرتے تھے لیکن تاش یا کسی اور قسم کی قماربازی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ہوم رول لیگ لکھنؤ کانگریس کے بعد، مسز بیسنٹ کی گرفتاری تک یعنی ۱۶ جون ۱۹۱۷ تک، سکون تھا[۱] جناح خود بھی ہوم رول لیگ میں شریک ہوئے اور اپنے بے شمار ہم پیشہ اشخاص کو بھی اس میں شریک کیا۔ ہوم رول کی شاخیں بمبئی شہر کے مختلف حصوں میں، صوبۂ بمبئی اور خاص طور پر گجرات میں قائم کی گئی تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ہر ہفتہ پمفلٹ اور کتابچے شائع ہوتے، بمبئی میں کالبا دیوی اور مانڈوی کے علاقوں میں ڈنڈے پر تقریریں ہوتیں، گرگام میں ہر پندرھویں دن شاندار م

---

[۱] لارڈ Pentland گورنر مدراس نے مسز بیسنٹ کو ان کے ہوم رول لیگ کے پروپگنڈا کی وجہ سے اوٹاکمنڈ میں نظربند کر دیا تھا۔ م

چال میں بڑے بڑے جلسے ہوتے، جن میں جناح، تلک، کھاپرڈے، کھاڈلکر، کیلکر اور ہارنی مین، تقریریں کرتے تھے۔ شانتارام چال کے جلسوں کی خبریں سُن سُن کر گورنر، لارڈ ویلنگڈن کی نیند حرام ہوئی جاتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے عوام میں سیاسی شعور کے آثار پیدا ہونے لگے۔
یہی صورتِ حال گجرات کے بعض بڑے بڑے شہروں مثلاً، سورت، آنند، احمد آباد اور گودھرا اور ان کے پاس کے اضلاع کی ہوئی۔
ہوم رول لیگ کی پہلی یک سالہ تحریک نے ایک قومی فضا پیدا کردی جو آگے چل کر گاندھی جی کی عوامی تحریک کے لیے مفید ثابت ہوئی۔

گجراتی میں تقریر

عمر سوبانی، شنکرلال بینکر اور میں، تینوں مل کر تقریباً ہر روز ہی جناح کے چیمبر میں سیاسی پروپیگنڈے کا پروگرام بنایا کرتے تھے۔
جولائی ۱۹۱۷ میں گجرات سبھا کی دعوت پر گودھرا میں صوبائی پولیٹیکل کانفرنس ہوئی تھی۔ جس کے صدر گاندھی جی اور سکریٹری وَلبھ بھائی پٹیل تھے۔ اُس جلسے میں چوٹی کے جن لیڈروں نے شرکت کی اُن میں لوکمانیہ تلک، محمد علی جناح، کھاپرڈے، وِٹھل بھائی پٹیل، جہانگیر پیٹٹ اور پی۔ کے۔ تیلنگ تھے۔ اُن دنوں وَلبھ بھائی پٹیل کا شمار لیڈروں میں نہیں ہوتا تھا۔ جلسے میں جب جناح تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو گاندھی جی نے اصرار کیا کہ جناح گجراتی میں بولیں۔ اُن کی بات مانتے ہوئے جناح نے اپنی تقریر یہ کہہ کر گجراتی میں شروع کی:
"صاحبو، گاندھی جی کے حکم سے میں گجراتی میں بول رہا ہوں۔ تقریر کا پہلا حصّہ گجراتی میں ہوگا لیکن اپنی تقریر میں انگریزی میں پورا کروں گا۔"
اس پر بڑا قہقہہ لگا جس کے بعد جناح نہایت شستہ انگریزی میں

چالیس منٹ تک بولتے رہے۔

مسز بیسنٹ کی رہائی کی کوشش

ستمبر ۱۹۱۷ میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس شملے میں ہوا۔ جناح اس میں شریک ہوئے۔ وہاں اُنھوں نے تیج بہادر سپرو کے ساتھ مل کر مسز اینی بیسنٹ کی رہائی کی بڑی کوشش کی مگر اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی۔

جیسا دیس ویسا بھیس

شادی کے بعد مسز جناح شملہ پہنچیں جہاں اُن کے شوہر مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے گئے تھے۔ ایک دن میاں بیوی، وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ کے یہاں ڈنر پر مدعو تھے۔ وہاں اُن سے رتی کا تعارف کرایا گیا۔ اُن سے ہاتھ ملانے کے بعد رتی نے یورپی دستور کے مطابق جھک کر کورنش بجا لانے کی جگہ، ہندوستانی رواج سے نمستے کرتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔ ڈنر کے فوراً بعد وائسرائے نے اُنھیں پاس بُلا کر کہا "ایک بات کہوں مسز جناح؟ تمھارے شوہر کا مستقبل بڑا تابناک ہے۔ تمھارے لیے کسی طرح یہ مناسب نہیں کہ اُسے نقصان پہنچاؤ۔ روم میں رہو تو روم کے آداب برتو۔" "یور ایکسیلینسی، میں نے وہی تو کیا۔ ہندوستان میں رہ کر میں نے آپ کو ہندوستانی رواج کے مطابق سلام کیا۔" مسز جناح نے تڑسے جواب دیا۔ مسز جناح اور لارڈ چیمسفورڈ کی یہ پہلی اور آخری ملاقات ثابت ہوئی۔"

برجستگی

سن ۱۹۲۱ میں مسز جناح، نئی دلی میں ایک لنچ کے موقع پر لارڈ ریڈنگ کے ساتھ بیٹھی تھیں، جو وائسرائے تھے۔ اُن کے سامنے لارڈ ریڈنگ بار بار اپنا دُکھڑا رو رہے تھے: "ہائے مسز جناح،

کیا بتاؤں مجھے جرمنی جانے کی کتنی تمنا ہے! میں وہاں جانے کے لیے کس قدر بے قرار ہوں! لیکن افسوس، جا نہیں سکتا!"

مسز جناح نے پوچھا: "یور ایکسیلنسی، آخر آپ وہاں کیوں نہیں جاسکتے؟"

لارڈ ریڈنگ بولے: "بات یہ ہے کہ جرمن، ہم برطانوی لوگوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔" مسز جناح کہاں چوکنے والی تھیں، بولیں: "تو پھر آپ ہندوستان کیسے چلے آئے؟"

لارڈ ریڈنگ تلملا کر رہ گئے اور گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

رولٹ ایکٹ

سن ۱۹۱۹ میں رولٹ ایکٹ کی بنا پر جب بل پیش ہوا تو ہندوستان میں مخالفت کی لہر سی دوڑ گئی۔ لیجسلیٹو کونسل میں سُر یندر ناتھ بنرجی، سری نواس شاستری، سرتیج بہادر سپرو، محمد علی جناح اور وٹھل بھائی پٹیل نے اس کے خلاف سخت تقریریں کیں۔ جناح نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ جو حکومت اس قسم کے قوانین نافذ کرتی ہے اُسے مہذب کہلانے کا حق حاصل نہیں۔

اس ایکٹ کی مخالفت کی تحریک کے سلسلے میں برطانوی حکومت، جن آٹھ ہندوستانیوں کو دیس نکالا دینا چاہتی تھی، اُن میں جناح کا نام بھی شامل تھا۔ لیکن بعد میں یہ مصیبت صرف بی۔ جی۔ ہارنی مین کے سر گئی۔ ہارنی مین بیمار تھے اس لیے انگلستان بھیج دیے گئے۔ اس کے کچھ ہی دن بعد بمبئی کے ایمپائر تھیٹر میں پہلی آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا جلسہ ہوا جس کے صدر لالہ لاجپت رائے تھے۔ اسٹیج پر این۔ ایم۔ جوشی، بی۔ پی۔ واڈیا، دیوان چمن لال،

سید عبداللہ بریلوی بیٹھے تھے، میں بھی وہاں موجود تھا۔ مسز جناح تھیٹر کے ایک باکس میں سے کارروائی دیکھ رہی تھیں۔ ہارنی مین کے ملک بدر کیے جانے پر احتجاجی تجویز رتی ہی نے پیش کی۔ اپنی باکس کی نشست سے پانچ منٹ کی نہایت فصیح وبلیغ تقریر میں انھوں نے اپنی بات کہہ دی اور یہی ان کی ایک پبلک تقریر تھی۔

ہوم رول لیگ کا وفد

مسز اینی بیسنٹ ۱۹۱۹ کے شروع ہی سے اس کوشش میں لگی ہوئی تھیں کہ ہوم رول لیگ کا ایک وفد برطانیہ جاکر پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت دے۔ اس وفد کے لیے مسز بیسنٹ نے جناح، سی۔ پی۔ راما سوامی آئر، بی۔ پی۔ واڈیا اور تیلنگ کے نام تجویز کیے۔ ۲۹ جنوری کو مسز بیسنٹ، گاندھی جی سے ملیں اور اُنھیں بھی ایک آزاد ممبر کی حیثیت سے شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر یہ نہ ہوسکا۔ گاندھی جی کی حکمت عملی سے بعد کے واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کرلی کہ مسز بیسنٹ کو ہوم رول لیگ کی صدارت ہی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مسز بیسنٹ، جس جلسے میں سازشی اور ناگوار حالات میں استعفا دینے پر مجبور ہوئیں، اُس میں جناح موجود تھے۔ گاندھی جی مسز بیسنٹ سے ہوم رول لیگ کا پلیٹ فارم چھین لینے پر اڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کا سیاسی فلسفہ یہ تھا کہ "مجھ سے اتفاق کرو ورنہ سیاست میں تمھاری کوئی جگہ نہیں"۔

مانٹیگ چیمسفورڈ رپورٹ

سن ۱۹۱۸ میں مانٹیگ چیمسفورڈ رپورٹ شایع ہوئی جس میں ہندوستان کی خود مختاری کی طرف قدم بڑھانے کی

ایک اسکیم پیش کی گئی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں اس کی بڑی مخالفت ہوئی۔ البتہ گاندھی جی کا خیال تھا کہ رپورٹ میں ہندوستان کو اتنا ہی کچھ دیا گیا ہے جتنا ہضم کرنا اُس کے لیے ممکن ہے۔ مسز بیسنٹ نے رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سفارشات نہ تو اس لائق ہیں کہ برطانیہ انھیں پیش کرتا اور نہ اس قابل ہیں کہ ہندوستان انھیں قبول کرے، پھر بھی وہ انھیں کلی طور پر رَد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جناح اس رپورٹ سے بہت مایوس ہوئے لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ سفارشات کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ مسز بیسنٹ سیاسی طاقت رکھتی ہیں اس لیے اُنھیں اپنا ہم خیال بنانا چاہیے۔ چنانچہ ان کی دعوت پر مسز بیسنٹ بمبئی آئیں اور دونوں کی دو گھنٹوں تک بات چیت ہوتی رہی۔ جناح چاہتے تھے کہ مسز بیسنٹ سفارشات پر کڑی تنقید کرنے سے اجتناب کریں۔ بات چیت کے بعد تھکے ماندے جناح کمرے سے باہر نکلے تو میں نے اُن سے پوچھا "کہو بھئی، کیا ہوا؟" وہ اپنا سر پکڑتے ہوئے بولے " ہوا کیا! یاد رکھو، کبھی عورت سے بحث نہ کرنا۔"

شرربار تقریر

سن ۱۹۱۸ میں دلّی میں " وار کانفرنس " منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں لوکمانیہ تلک کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس کے بعد ایسی ہی ایک کانفرنس بمبئی میں بھی کی گئی جس میں ہوم رول لیگ کو مدعو کیا گیا تھا۔ جناح، لوکمانیہ تلک، کھیلکر، ہارنی مین وغیرہ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ جلسہ شروع ہوا

تو تلک ایک تجویز پیش کرنے کھڑے ہوئے۔ ابھی اُن کے منہ سے ایک لفظ بھی نکلنے نہ پایا تھا کہ لارڈ ولینگڈن نے (جو صوبہ بمبئی کے گورنر اور جلسے کے صدر تھے) انھیں "آؤٹ آف آرڈر" کہہ کر بولنے سے روک دیا اور بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ پھر کیا تھا، ہوم رول لیگ کے جتنے لیڈر وہاں جمع تھے سب کے سب جلسہ گاہ سے احتجاجاً اُٹھ کر چلے گئے لیکن جناح بیٹھے رہے۔ پھر انھوں نے اپنی تقریر میں تلک کی اہانت پر لارڈ ولینگڈن کے رویّے کی سخت مذمت کی۔ جناح کی انتہائی شرربار تقریر حاضرین دم بخود ہو کر سنتے رہے۔ تقریر ختم کر کے جناح بھی جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے۔

ایڈریس پر اعتراض اوائل نومبر میں لارڈ اور لیڈی ولینگڈن کے بعض وفادار دوستوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گورنری کے عہدے سے سبکدوش ہونے پر، بمبئی کے شہریوں کی جانب سے اُن کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا جائے۔ ہوم رول لیگ کے ارکان اور جناح نے اس کی مخالفت کی۔ ہم سب کا کہنا تھا کہ جن لوگوں کو سپاس نامہ دینا ہو وہ بڑے شوق سے لارڈ ولینگڈن کے دوستوں اور مداحوں کی حیثیت سے دیں لیکن بمبئی کے شہریوں کے نام پر یہ تقریب منعقد نہ کی جائے۔ یہ مشورہ قبول نہیں کیا گیا اور شیرف آف بمبئی کو بمبئی کے شہریوں کی طرف سے جلسہ طلب کرنے کے لیے خط بھیج دیا گیا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اس تجویز کی مخالفت بڑھتی گئی۔ اُن دنوں گاندھی جی تقریباً ہر ہفتہ بمبئی آیا کرتے تھے۔ ایک دن ہم لیگ

اُن کے پاس پہنچے اور اُن سے درخواست کی کہ وہ بھی ہماری تحریک کی تائید کریں لیکن جس طرح مسز اینی بیسنٹ کے شہر بدر کیے جانے کے معاملے میں[1] انھوں نے مایوس کیا تھا، اس موقع پر بھی انھوں نے وہی کیا۔ عذر یہ پیش کیا کہ وہ تو احمد آباد کے شہری ہیں، ہماری تحریک کی تائید کیسے کر سکتے ہیں، ہم نے اُن کو ہزار سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ اصولی بات ہے، اس کا تعلق شہریت سے کچھ نہیں ہے، لیکن وہ برابر انکار کرتے رہے۔

ہنگامہ

شیرف آف بمبئی کا طلب کیا ہوا جلسہ ٹاؤن ہال میں ۱۰ دسمبر ۱۹۱۸ کو ہونے والا تھا اور اس میں لارڈ ویلنگڈن کو ایڈریس پیش کیا جانے والا تھا۔ ہم تین سو آدمی جناح کی رہنمائی میں ایک دن پہلے رات کے دس بجے ٹاؤن ہال پہنچ گئے۔ تاکہ صبح دروازہ کھلتے ہی سب سے پہلے ہال میں گھس جائیں۔ اگلے دن واقعی ہم سب آٹھ بجے صبح ہال میں داخل ہو گئے اور چھ بجے شام تک وہاں جمے رہے۔ پھر پولیس آئی، ہنگامہ ہوا اور ہم وہاں سے نکال دیے گئے۔ شام کے پانچ بجے کے قریب مسز جناح بھی ٹاؤن ہال کی سیڑھیاں چڑھتی دکھائی دیں۔ خطرے کے باوجود وہ بڑی جرأت کے ساتھ آگے بڑھتی جارہی تھیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ رتی کے والد سر ڈنشا پیٹٹ مخالف پارٹی میں تھے۔ ہنگامے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ درہم برہم ہو گیا اور ایڈریس

---

[1] اس موقع پر گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ انھیں ایک سو والنٹیرز دیے جائیں جو بمبئی سے کوئمبٹور تک پیدل جانے کی ستیہ گرہ کے لیے تیار ہوں، اس کے بعد مسز بیسنٹ رہا ہو جائیں گی۔ — م

پیش نہ کیا جاسکا۔[1] یہ جناح کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

جناح ہال

جناح کی شاندار کامیابی سے لوگ اتنے خوش ہوئے کہ عمر سوبانی نے "جناح میموریل ہال" کی شکل میں ایک مستقل یادگار قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور لوگوں سے ایک ایک روپیہ چندہ دینے کی اپیل کی۔ ایک ہی مہینے کے اندر ۶۵ ہزار روپے جمع ہو گئے جس سے کانگریس ہاؤس کے احاطے میں ہال بنوایا گیا۔ اس ہال کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کی خاطر مسز بیسنٹ خاص طور سے بمبئی آئیں تھیں۔[3]

دو ہوم رول لیگ

فروری ۱۹۱۹ میں مسز بیسنٹ کے ساتھ ساتھ میں بھی ہوم رول لیگ سے مستعفی ہو کر مسز بیسنٹ کی نیشنل ہوم رول لیگ میں اعزازی سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس وقت ملک میں

---

[1] رتی کی شادی کے بعد سر ڈنشا پیٹٹ نے نہ تو کبھی جناح سے بات کی نہ رتی سے۔ جب رتی پیرس میں بیمار تھیں تو سر ڈنشا انھیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ دوا دینے کا وقت آتا تو وہ دیوار کی طرف منہ کرکے کہتے "رتی کے دوا پینے کا وقت ہو گیا"۔

[2] اسی موقع پر جناح کے منہ پر ایک پارسی والنٹیر نے گھونسا بھی مارا۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ بعد میں جناح سے میں نے کہا کہ اگر وہ پولیس کیس کرنا چاہیں تو میں ملزم کو شناخت کر سکتا ہوں لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔

[3] یہ ہال کانگریس ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں موجود ہے اور اس پر ایک کتبہ لگا ہے جس کے الفاظ ہیں:

THIS HALL HAS BEEN RAISED BY THE CITIZENS OF BOMBAY TO COMMEMORATE THEIR HISTORIC TRIUMPH OF THE 10TH. DECEMBER 1918 UNDER THE BRAVE AND BRILLIANT LEADERSHIP OF MAHOMED ALI JINNAH

یہ ہال اب بھی "پیپلس جناح ہال" کے نام سے مشہور ہے ۔۔۔ م

دو جماعتیں ہوم رول لیگ کے نام سے کام کر رہی تھیں، ایک نیشنل ہوم رول لیگ اور دوسری آل انڈیا ہوم رول لیگ، جناح، آل انڈیا ہوم رول لیگ کی شاخ کے صدر تھے۔ فروری ۱۹۲۰ میں انھوں نے مجھے آل انڈیا ہوم رول لیگ میں شریک ہونے کو کہا لیکن میں نے مشورہ دیا کہ دونوں لیگیں مل جل کر کام کریں تو بہتر ہوگا۔ میں اور عمر سوبانی اس اتحادِ عمل کے لیے بڑے بے چین تھے۔ چنانچہ ہم تینوں نے اپنی تجویز مسز بیسنٹ کو بھیج دی۔ وہ بمبئی آئیں اور اس مسئلے پر انھوں نے ڈھائی گھنٹے بات چیت کی۔ اس کے بعد مجھے آل انڈیا ہوم رول لیگ کی کونسل میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔

گاندھی جی لیگ کے صدر

جناح چاہتے تھے کہ مانٹیگ چیمسفورڈ ریفارم پر مؤثر طریقے سے عمل کرنے کی خاطر ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر وہ گاندھی جی کو ہوم رول میں شریک کرنے میں کامیاب ہوگئے تو ریفارم پر عمل کرنے میں گاندھی جی پر قابو پایا جاسکے گا۔ چنانچہ جیکر کی مخالفت کے باوجود جناح نے گاندھی جی کا نام آل انڈیا ہوم رول لیگ کی صدارت کے لیے پیش کردیا۔ اس پیشکش پر گاندھی جی نے ۱۰ مارچ ۱۹۲۰ کو جو خط بھری نواس شاستری کو لکھا تھا وہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے:-

"چونکہ گذشتہ سال میں نے کانگریس کے معاملات میں کسی حد تک حصّہ لیا تھا اس لیے اب مجھ سے کہا جارہا ہے کہ اور زیادہ عملی کام کرنے کی خاطر میرے لیے بہتر ہوگا کہ میں کسی جماعت میں شریک ہوجاؤں۔ یہ مطالبہ ایسے لوگوں کی طرف سے کیا جارہا ہے جن کے

ساتھ کام کرنے کی عزت مجھے اُس وقت سے حاصل ہے جب میں اُن کی جماعت میں شریک بھی نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے مجھے آل انڈیا ہوم رُول لیگ میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ میں نے اُن سے صاف کہہ دیا ہے کہ اپنی زندگی کی ایسی منزل پر پہنچ کر جہاں بہت سے معاملات میں میرے خیالات میں پختگی آچکی ہے، کسی جماعت میں صرف اسی حالت میں شامل ہو سکتا ہوں جبکہ میرے لیے اُس کی پالیسی کو متاثر کرنا ممکن ہو نہ کہ اس کی پالیسی سے میرا متاثر ہونا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنے دماغ میں نئے خیالات اور نئی روشنی کو آنے ہی نہ دوں گا۔ البتہ اِس پر ضرور اصرار کرونگا کہ یہ نئی روشنی واقعی تیز اور چمکدار بھی ہو۔ میں نے اپنے دوستوں کے سامنے یہ پانچ نکات پیش کئے ہیں:۔

(۱) اگر ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے اپنا مقام پیدا کرنا ہے تو ملک کی سیاسی زندگی میں انتہائی ایمان داری کو داخل کرنا چاہیے۔ اِس کی پہلی شرط ہے کہ حق و صداقت پر اِس درجہ ایمان ہو کہ کسی قیمت اور مصلحت پر اسے قربان نہ ہونے دیا جائے۔

(۲) "سودیشی" ہماری پہلی منزل ہونی چاہیے۔ کونسل کی ممبری چاہنے والے پہلے اس کا عہد کریں کہ وہ ملکی صنعتوں کو۔۔ بالخصوص کپڑے کی صنعت کو۔۔ ہر حال میں بچانے کی کوشش کریں گے۔

(۳) ہندی اور اُردو کے امتزاج سے بنی ہوئی زبان "ہندستانی" کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلینا چاہیے۔ امپریل کونسل کی ممبری کے امیدواروں کو عہد کرنا ہوگا کہ وہ قومی معاملات میں امپریل کونسل

کے ایوان میں انگریزی کے بجائے ہندستانی کو اور لوکل کونسل میں علاقائی زبان کو رواج دینے کی کوشش کریں گے۔ انھیں اس کا بھی عہد کرنا ہوگا کہ اسکولوں میں ہندستانی کی تعلیم کو ایک لازمی مضمون کی طرح، اور دیوناگری یا اُردو رسم خط کو اختیاری حیثیت سے رائج کریں گے۔ انگریزی زبان صرف ڈپلومیٹک یا سرکاری کاموں کے لیے استعمال کی جائے گی۔

(۴) جتنا جلد ممکن ہو سکے لسانی بنیادوں پر ہندوستان کی تنظیم کی جائے۔

(۵) میں سیاسی اور مذہبی نقطۂ نظر سے ہندو مسلم اتحاد کو اپنے غیر متزلزل عقیدے کا جز مانتا ہوں۔ اس پر عمل کرنے میں باہمی تعاون، رواداری اور کسی ایک طبقے کی تکلیف کو سب کی تکلیف سمجھنے کا احساس پیدا کرنا ہوگا۔ لیکن ان مقاصد کے لیے لیگ کے لائحۂ عمل میں ایک ساتھ کھانا پینا اور ذات سے باہر شادی بیاہ رچانا شامل نہیں ہے۔ البتہ مسئلہ خلافت پر انتہائی تعاون کو جگہ دی جائے گی۔ ان باتوں پر اپنے احباب سے گفتگو کے دوران میں یہ بات میں نے واضح کر دی ہے کہ میں اپنے عدم تشدد کے عقیدے کو آئینی طور سے منوانے کی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ چونکہ میں کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتا اس لئے چاہوں گا کہ لیگ بھی پارٹی سے الگ ایک ایسی جماعت ہو جو پارٹی کے امتیاز کے بغیر اُن لوگوں کی حمایت کرے جو ایماندار ہوں اور خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لیگ، کانگریس کی مخالف جماعت

نہیں بن سکتی - اس کو تو کانگریس کے مقاصد کو حاصل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہونا چاہیے - میری صلاحیتوں اور میری کوتاہیوں سے آپ جس طرح اور جس قدر بھی واقف ہیں اس کے پیش نظر بتائیے کہ مجھے لیگ میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں ؟"

مسری نواس شاستری نے اس خط کا کیا جواب دیا، یہ تو معلوم نہ ہو سکا لیکن گاندھی جی ہوم رول لیگ کے صدر بن گئے اور اسی وقت سے گویا انھوں نے آگ سے کھیلنا بھی شروع کر دیا۔ ۱۰ مارچ کو انھوں نے اعلان کیا کہ اگر اُن کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو وہ عدم تعاون کی تحریک شروع کردیں گے - یہی وہ ہتھیار تھا جس سے وہ تشدد کے بغیر لڑ سکتے تھے۔[1]

یکم اگست ۱۹۲۰ کو تلک کا انتقال ہوگیا۔ اس کے چھ ہفتے بعد کلکتے میں کانگریس کا خصوصی اجلاس ہوا، لالہ لاجپت رائے صدر تھے۔ جب گاندھی جی نے عدم تعاون (نان کوآپریشن) کی تجویز پیش کی تو مسز بیسنٹ، جناح، سی۔ آر۔ داس اور مہاراشٹر کے تلک کے ساتھیوں نے تجویز کی مخالفت کی - جناح، اُن کی بیوی، جیکر، عمر سوبانی، جمنا داس اور شنکر لال "کانگریس اسپیشل" ٹرین سے کلکتے

---

[1] اس کے بعد ہی بمبئی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ تاریخی جلسہ ہوا جس میں خود گاندھی جی نے تحریک خلافت کی تائید میں تجویز پیش کی تھی - اسی جلسے میں اعلان کیا گیا تھا کہ اگر حکومت یہ مطالبہ منظور نہ کرے تو عدم تعاون شروع کر دیا جائے۔ تلک اس تجویز کے بڑے مخالف تھے ــــ م

گئے تھے۔ ہوڑہ اسٹیشن پر موتی لال نہرو جناح سے ملے۔ اس وقت میں بھی موجود تھا۔ موتی لال نہرو نے جناح کو بتایا کہ گاندھی جی عدم تعاون کی تجویز پیش کرنے والے ہیں جس کے معنی یہ ہوں گے کہ کونسل، اسمبلی وغیرہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ موتی لال نے جناح کو مشورہ دیا کہ وہ مسز بیسنٹ، سی۔ آر۔ داس، لالہ لاجپت رائے اور مالویہ کے ساتھ مل کر اس تجویز کو نامنظور کرائیں۔ لیکن اس کے دس بارہ دن بعد جب تجویز پر ووٹ لینے کا وقت آیا تو اپنے بیٹے 'جواہر لال نہرو کے اثر میں آکر خود موتی لال نے گاندھی جی کے ساتھ اُس تجویز کی موافقت میں ووٹ دیا۔ ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی تو ایسا گمان ہونے لگا کہ تجویز نامنظور ہو جائے گی۔ چنانچہ نہایت ہوشیاری سے رائے شماری کا کام اگلے دن پر اُٹھا رکھا گیا۔ دوسرے دن عمر سوبانی اور شنکر لال ادھر اُدھر سے کوئی سو آدمی جلسے میں پکڑ لائے اور اُن سب نے گاندھی جی کی تجویز کے حق میں ووٹ دے دیا۔ تجویز معمولی اکثریت سے منظور ہو گئی۔ یہ ساری داستان اب تک ڈاکٹر امبیڈکر کے سوا اور کسی نے بیان نہیں کی ہے۔

سودے بازی

ہم لوگوں کو کلکتہ سے بمبئی لوٹے پندرہ روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ گاندھی جی نے جناح پر گویا بم کا گولہ مارا۔ بات یہ ہوئی کہ گاندھی جی نے علی برادران سے مل کر تحریک خلافت کی جو حمایت کی تھی وہ جناح کو بالکل ناپسند تھی اور یہ بات گاندھی جی کو سخت ناگوار گزری۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاندھی جی نے مسلم لیڈروں سے جن میں علماء اور مذہبی پیشوا بھی تھے، ایک سمجھوتا کیا جس کی شرط یہ تھی کہ اگر مسلمان لیڈر انڈین ہوم رُول لیگ میں اپنے تعاون کا اعلان کر دیں اور گائے کا ذبیحہ

بند کردینے کا وعدہ کریں تو گاندھی جی ہندوؤں کو خلافت تحریک کی حمایت پر آمادہ کریں گے۔ اُس وقت جناح اور عمر سوبانی دونوں نے گاندھی جی کو اس سودے بازی سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے گاندھی جی کو متنبہ کیا کہ ملکی سیاست میں مذہبی رعایت مناسب نہیں ہے مگر اُن دونوں علی برادران اور گاندھی جی، دونوں کا نعرہ تھا: "جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا مخالف ہے۔ جو گاندھی جی کے ساتھ نہیں وہ غدار اور ٹوڈی ہے، برطانوی ایجنٹ ہے، ملک کے مفاد کے خلاف ہے"۔ اس قسم کی نعرہ بازی اور پروپیگنڈے کے جو لوگ شکار ہوئے اُن میں جناح کی شخصیت سب سے نمایاں اور اہم تھی۔

علاحدگی

بمبئی ہوم رول لیگ کے صدر کی حیثیت سے جناح کی طاقت بے پناہ تھی۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ کو عدم تعاون کی تجویز کے منظور کئے جانے کے بعد عمر سوبانی اور شنکر لال اس کے سکریٹری کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ اُن کی جگہ میں اور کنہیا لال منشی مقرر کئے گئے۔ ستمبر ۱۹۲۰ کے کلکتہ اجلاس اور دسمبر ۱۹۲۰ کے ناگ پور کانگریس کے درمیان گاندھی جی نے جناح کی سیاسی طاقت کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کے بعد جو واقعات ملک میں رونما ہوئے اُن کا اثر آزادی کے ۱۸ سال بعد بھی برابر محسوس ہوتا رہا ہے۔

گاندھی جی کے مشورے سے اُن کے ساتھیوں نے ہوم رول لیگ کے نام اور دستور میں ترمیم اور تنسیخ کرنے کے لیے، لیگ کا ایک جلسہ طلب کیا۔ تجویز یہ تھی کہ ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) کے بجائے مکمل آزادی — "پورن سوراج" کو نصب العین بنایا جائے۔ آئینی

احتجاج کے بجائے پُرامن احتجاج کا طریقہ اپنایا جائے جس میں عدم تعاون اور عام قانون شکنی بھی شامل ہو۔ یہ بھی کہا گیا کہ ہوم رول لیگ کا نام بدل کر "سوراج سبھا" کر دیا جائے۔ جناح اور ان کے ساتھی ان بنیادی تبدیلیوں کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ چنانچہ جناح، جیکر، منشی، میں اور ہمارے پندرہ ساتھیوں نے ہوم رول لیگ یعنی سوراج سبھا سے استعفا دے دیا۔ اس طرح ہوم رول لیگ پر غاصبانہ قبضہ کر کے گاندھی جی نے جناح اور ان کے ساتھیوں کو الگ کر دیا اور اس کے بعد "سوراج سبھا" بھی ختم کر دی گئی۔

گاندھی جی کی کامیابی دسمبر میں کانگریس کا اجلاس ناگ پور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کا میدان گاندھی جی کے ہاتھ رہا۔ اس موقع پر کانگریس نے برطانیہ سے اپنا ناتا توڑا اور آئینی احتجاج کے طریقۂ کار کو خیرباد کہہ دیا۔ عدم تعاون کی تجویز منظور ہوتے ہی کانگریس کی ہیئت بدل گئی۔ پنڈت مالویہ، جناح اور کھاپرڈے نے گاندھی جی کے نظریے کی سخت مخالفت میں زبان کھولی لیکن لوگوں نے اتنا ہنگامہ مچایا کہ وہ تقریر بھی نہ کر سکے۔ جناح نے ملک کو عدم تعاون کے منفی رویّے سے باز رکھنے کی ایک اور کوشش کی۔ انھوں نے گاندھی جی کے خیالات کی مخالفت کرتے ہوئے ایک نہایت بے باک تقریر کی۔ لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کو لسانی ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز بھی منظور کی گئی۔ اس تجویز کی مصلحت اور انگریزی زبان کو ترک کر دینے کا فائدہ، ابھی تک نہ ہندوستان سمجھ سکا نہ دُنیا۔ ناگ پور اجلاس میں گاندھی جی نے

یہ بھی اعلان کردیا کہ وہ ایک برس میں یعنی ۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ تک ہندوستان کو سوراج دلادیں گے۔

گول میز کانفرنس

دسمبر ۱۹۲۱ میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ تھے۔ انھوں نے جناداس اور پردے ناتھ کنزرو کے ذریعے ایک گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ اس کانفرنس میں برطانوی حکومت کی نمائندگی وہ خود کرنے والے تھے۔ جن ہندوستانی لیڈروں کو شرکت کی دعوت دی جانے والی تھی اُن میں گاندھی جی اور اُن کے رفقا کے بھی نام تھے۔ گاندھی جی نے اس میں شریک ہونا منظور کرلیا اس کے بعد جب میں ایک روز ان سے ملنے گیا تو وہ ولبھ بھائی پٹیل اور بعض مسلمان علماء سے گفتگو کرنے میں مصروف تھے۔ اُن لوگوں کا کہنا تھا کہ جب تک حکومت علی برادران کو قید سے رہا نہ کردے اُس وقت تک گاندھی جی کو گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ اس گفتگو کے تقریباً ایک گھنٹے بعد سر تیج بہادر سپرو کو تار بھجوادیا گیا کہ گاندھی جی نے لارڈ ریڈنگ کی دعوت رد کردی ہے۔

جناح کی پریشانی

۲ جنوری ۱۹۲۲ کی شام کو میں جناح سے ملا۔ رتی اُن کے پاس تھیں۔ ہم لوگ چار بجے صبح تک یعنی مسلسل سات گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ جناح یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ گاندھی جی کے انکار کا ردِ عمل مسز بیسنٹ اور سر تیج بہادر سپرو پر کیا ہوا؟ انھوں نے بتایا کہ وہ (جناح) ایک کانفرنس بمبئی میں بلانے والے ہیں جس میں اُمبالال سارا بھائی، پنڈت مدن موہن مالویہ، جیکر، پرشوتم داس ٹھاکرداس، نٹراجن اور بھورگری کے علاوہ گاندھی جی کو شرکت کی

دعوت دی جائے گی ۔ اس کانفرنس کے ذریعے وہ لارڈ ریڈنگ کو گول میز
کانفرنس کی دعوت کی تجدید پر رضامند کرنا چاہتے تھے تاکہ گاندھی جی
کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کا موقع ملے ۔ جناح نے مجھے
انبالال کے مکان پر بلایا ۔ وہیں کانفرنس کے انتظامات کے بارے
میں گفتگو ہوئی ۔ جناح چاہتے تھے کہ میں اس کام میں اُن کی مدد کروں ۔
مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ مسز بیسنٹ کو شرکت کی دعوت دوں ۔ چنانچہ
ہم نے اُنھیں تار کے ذریعے صورتِ حال کی اطلاع دی ۔ مسز بیسنٹ
کا جواب آیا کہ اُن کا بمبئی جانا بے سود ہوگا کیونکہ گاندھی جی تعاون کے
لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے ۔ یہ کانفرنس تو ہوئی لیکن گاندھی جی نے
اس میں واقعی بڑا منفی رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے معاملات کو سلجھانے
میں مدد ملنے کے بجائے اچھی خاصی رکاوٹ پیدا ہوگئی ۔ یہاں تک کہ
جلسے کے صدر، سر شنکرن نائر، تنگ آکر جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے ۔
کانفرنس قطعی ناکام رہی ، اس کے ذمہ دار بڑی حد تک گاندھی جی تھے ۔
وائسرائے نے دیکھا کہ جس نفسیاتی مقصد کی خاطر وہ گول میز کانفرنس کی
پیشکش کر رہے تھے وہ باقی نہیں رہا ۔ کلکتے میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ
ہو چکا تھا حالاں کہ لارڈ ریڈنگ اُسی کو روکنا چاہتے تھے ۔ اس
واقعے کا اُنھیں بڑا صدمہ تھا ۔ انھوں نے گول میز کانفرنس کی
دعوت کی تجدید فضول سمجھی ۔ جناح بھی بے حد مغموم تھے ۔ اُنھیں حکومت
اور گاندھی جی دونوں نے صدمہ پہنچایا تھا ۔ جناح نے بڑے عزم کے
ساتھ ایک نئی پارٹی بنانے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں جیکر اور
نٹراجن اُن کی مدد پر آمادہ نہیں ہوئے ۔ اس کے بعد جناح سیاسی میدان

سے ہٹ گئے اور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔

قحبہ گری

مزدور تحریک اور سماجی اصلاح کے سلسلے میں جناح اور رتی، دونوں نے میرے کام میں بڑی دلچسپی لی تھی[1] اور واقعہ یہ ہے کہ مسز بیسنٹ کے بعد، اس سلسلے میں مجھے سب سے زیادہ مدد مسز جناح سے ملی۔ اپنے شوہر کی طرح وہ بھی اس مسئلے کو حقیقت پسندی اور عملی زاویۂ نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ جسم فروشی کو قطعی طور پر ختم کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ اس اخلاق سوز تجارت میں بے رحمی اور انسانیت سوزی کی جو وارداتیں ہوتی ہیں، ہماری کوششیں اُنھیں کے تدارک یا انسداد تک محدود تھیں۔ مسز رتی جناح کو میرے اِن کاموں میں کتنی گہری دلچسپی تھی، اِس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۸ اگست ۱۹۲۷ کو مجھے لکھا تھا:

"...... آپ (اُن علاقوں میں) مجھے کب اپنے ساتھ لے چلیں گے تاکہ میں بذاتِ خود اُن حالات کا مطالعہ کرسکوں جن میں وہ بدنصیب عورتیں زندگی بسر کرتی ہیں۔ میں اُن جگہوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جو 'اڈّا' کہلاتی ہیں۔"

اِن علاقوں میں رتی اور مس ڈیوس[2] کے ساتھ گھنٹوں گھوم کر میں نے اُن کو وہاں کے حالات دکھائے۔

---

[1] مصنف نے آوارہ گرد بچوں اور بمبئی کی پیشہ کرنے والی عورتوں کی زبوں حالی دُور کرنے اور بردہ فروشی کے خلاف اسمبلی اور میونسپل کارپوریشن میں بہت سی کارروائیاں کی تھیں ـــ م [2] عمر کھاڑی چلڈرنس ہوم کی سپرنٹنڈنٹ۔

نئی پارٹی کانگریس نے ۱۹۲۱ میں عدم تعاون (نان کوآپریشن) تحریک شروع کی جو ۱۲ فروری ۱۹۲۲ کو باردولی کی تجویز کی رُو سے ملتوی کردی گئی۔ اُس کے بعد حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک اور کمیٹی مقرر کی گئی۔ خاص مسئلہ یہ تھا کہ کونسل میں شرکت کی جائے یا نہیں؟ لیکن کافی بحث مباحثے کے بعد بھی کمیٹی اس سوال پر متفق نہ ہوسکی۔ حکیم اجمل خاں، وٹھل بھائی پٹیل اور موتی لال نہرو، کونسل میں جانے کے حق میں تھے اور ڈاکٹر انصاری، سری نواس آئنگر اور راج گوپال آچاریہ اس کے مخالف تھے۔ دسمبر ۱۹۲۲ میں گیا میں کانگریس کا اجلاس، سی۔آر۔داس کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں کونسل جانے کے خلاف فیصلہ ہوا تو سی۔آر۔داس، کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہوگئے۔ انھوں نے موتی لال نہرو کے ساتھ "سوراج پارٹی" بنائی۔ اس پارٹی نے کانگریس ہی کا سارا پروگرام یہاں تک کہ عدم تعاون کا اصول تک اپنا لیا، صرف کونسل جانے کی حمایت کی حد تک اس کی پالیسی کانگریس سے مختلف تھی۔ جب انتخابات ہوئے تو مرکزی اسمبلی کی ایک سو نشستوں میں سے ۴۲ نشستیں سوراج پارٹی نے حاصل کیں۔ یہ خاصی کامیابی کی دلیل تھی۔ پارٹی کے لیڈر موتی لال نہرو منتخب ہوئے۔

جناح اور موتی لال نئی مرکزی اسمبلی میں موتی لال نہرو اپنے ۴۰ رفقا کے ساتھ جناح اور مالویہ جی کے گہرے تعاون سے کام کرنے لگے۔ اس طرح حزبِ مخالف میں تیس ارکان کا اور اضافہ ہوگیا۔ یہ سب مل کر "نیشنلسٹ پارٹی" کہلاتے تھے۔ اُن دنوں اسمبلی میں سر پرشوتم داس ٹھاکر داس،

جی۔ ڈی۔ برلا، کے۔ سی۔ نیوگی، شان مکھم چیٹی، سری نواس آئنگر، لالہ لاجپت رائے، وکٹر ساسون، وٹھل بھائی پٹیل، جیسے چوٹی کے لیڈر دکھائی دیتے تھے۔ اسمبلی کا سب سے شاندار اور نمایاں پہلو جناح اور موتی لال نہرو کی رفاقت اور اُن کا شانہ بہ شانہ کام کرنا تھا۔

ستمبر ۱۹۲۴ء کے اجلاس کے دوران میں مرکزی اسمبلی کے آزاد ممبروں میں سے ۲۴ نے ایک مستقل پارٹی بنائی جس کے لیڈر جناح منتخب ہوئے۔ اس طرح سوراج پارٹی اور آزاد ممبروں سے مل کر نیشلسٹ پارٹی خاصی مستحکم ہوگئی۔

اسمبلی میں سرگرمیاں

مئی ۱۹۲۴ء میں برطانوی لیبر گورنمنٹ نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد یہ جاننا تھا کہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ میں وہ کون سی ترمیمیں ہونی چاہئیں جن کی وجہ سے ہندوستانی حکومت مؤثر ہوسکے۔ اس کمیٹی کے چیرمین سر الگزینڈر مڈی مین تھے اور اس کے ارکان میں سر محمد شفیع، جناح اور ڈاکٹر پرانجپے تھے۔ کمیٹی نے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں شہادتیں لیں، لیکن ابھی اس کی سفارشات پر غور کرنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ برطانیہ کی لیبر حکومت کا تختہ اُلٹ گیا، اور اس کی جگہ کنزرویٹو پارٹی نے لے لی۔ یہاں ایک دلچسپ بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ شہادتیں لینے کے بعد بھی برطانوی حکومت کی تبدیلی کے پیشِ نظر، رپورٹ کے مسودے پر غور کرتے وقت چپکے چپکے بعض رجعت پسندوں سے دوبارہ شہادتیں لی گئیں۔ اور اس بار انھوں نے جو کچھ کہا وہ ان کے پہلے دیے ہوئے بیان سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے بعد دو رپورٹیں تیار کی گئیں۔ ایک پر ممبران کی اکثریت نے دوسری پر اقلیت نے دستخط کیے تھے۔

اقلیتی رپورٹ پر سپرو، شوا سوامی، جناح اور پرانجپے نے دستخط کئے تھے۔ سر محمد شفیع نے پہلے تو اکثریت کی رپورٹ پر دستخط کئے۔ اُس وقت وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر تھے لیکن جیسے ہی وہ اُس عہدے سے سبکدوش ہوئے انھوں نے اقلیت کی رپورٹ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

سوراج پارٹی کا تعاون

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سوراج پارٹی کی اسمبلی میں شرکت کا مقصد ریفارم یعنی ۱۹۱۹ ایکٹ کو ختم کرنا اور حکومت سے عدم تعاون تھا لیکن ایسے منفی پروگرام پر عمل کرنا موتی لال نہرو کے تدبر اور فراست کے خلاف ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے ٹھوس تجویزیں پیش کیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ گورنمنٹ ایک گول میز کانفرنس بلائے جس میں حکومت کے دستور پر بحث ہو۔ اس کی خاطر انھوں نے اپنے تعاون کا وعدہ بھی کیا لیکن افسوس، گورنمنٹ نے اِس پیشکش کو ٹھکرا دیا ورنہ آج ہندوستان کی تاریخ شاید کچھ اور ہی ہوتی۔

ووٹ کی قیمت

مئی ۱۹۲۴ میں اسمبلی کا اجلاس شملے میں ہوا۔ اس موقع پر لوہے اور فولاد کی صنعت کو مضبوط کرنے کی تجویز پیش ہوئی۔ اس کی رُو سے جمشید پور میں ٹاٹا کے کارخانے کو خاصی امداد ملنے والی تھی۔ اسمبلی کے بعض ممبر بل کے مخالف تھے۔ مگر ایک طرف موتی لال نہرو اور جناح کا باہمی تعاون تھا اور دوسری طرف ان دونوں کا حکومت سے بھی تعاون تھا۔ چنانچہ بل مخالفت کے باوجود منظور ہو گیا۔ اِس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ جس کا انکشاف تین سال بعد ہوا۔ جناح کے بنگلے پر ایک رات ڈنر تھا۔ موتی لال نہرو، ڈی۔ آر۔ ٹاٹا اور میں

شریک تھے ۔ وہاں اُس بل کا تذکرہ چھڑا ۔ جناح اُن دنوں کی اسمبلی کی چٹ پٹی باتیں سُنانے لگے ، جن پر خوب قہقہے لگے ۔ جناح نے کہا جس روز بل پر ووٹ لیے جانے والے تھے ۔ اُس سے ایک دن پہلے رات کے وقت رتن ٹاٹا بے تحاشہ بھاگے ہوئے سی سِل ہوٹل میں اُن کے (جناح کے) کمرے میں پہنچے اور بڑی گھبراہٹ میں چلّا کر کہنے لگے " جناح ، کچھ سُنا تم نے ؟ غضب ہوگیا ، اسمبلی کے ممبر ——— صاحب کہتے ہیں کہ اگر میں نے ایک بڑی بھاری رقم انھیں نہ دی تو وہ اِس بل کے خلاف ووٹ دیں گے "۔ یہ ممبر موتی لال کی پارٹی کے آدمی تھے ۔ رات زیادہ آگئی تھی پھر بھی جناح نے اُن صاحب کو جنھوں نے رقم کا مطالبہ کیا تھا اور اُسی ہوٹل میں مقیم تھے ، بُلوا بھیجا ، جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے ، جناح نے ڈانٹ کر کہا " رتن ٹاٹا مجھ سے شکایت کر رہے ہیں کہ آپ نے اُن سے اپنے ووٹ کی قیمت دس ہزار روپے طلب کی ہے ۔ اطمینان رکھیے ، یہ رقم آپ کو ہرگز نہیں ملے گی ۔ آپ جہنم میں جائیں اور سردست اس کمرے سے باہر تشریف لے جائیں "! یہ صاحب مُنہ لٹکائے وہاں سے چلے آئے اور مزے کی بات یہ کہ اگلے دن انھوں نے بل کے حق میں ووٹ دیا ۔ رتّی اور موتی لال کے ساتھ میں بھی اِس دلچسپ واقعے سے خوب لطف اندوز ہوا ۔ رتن ٹاٹا نے ، جو وہاں موجود تھے ، اس کی تصدیق کی ؛ موتی لال کو اس کا پہلے سے علم ہو چکا تھا ۔

یہ جناح اور موتی لال کے اُسی باہمی تعاون کا نتیجہ ہے کہ آج

ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعتیں مستحکم بنیادوں پر قائم ہیں۔ موتی لال کے دل میں جناح کی بے حد عزت تھی اور وہ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ بالکل یہی معاملہ جناح کا موتی لال کے ساتھ تھا۔

۱۹۲۳ سے ۱۹۲۹ تک

جنوری ۱۹۲۱ کی گول میز کانفرنس کی ناکام کوشش کے بعد جناح مایوس ہوکر سیاست سے کنارہ کش ہوگئے اور اپنی پریکٹس کی طرف توجہ کرنے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ کانگریس اور حکومت، دونوں نے غیر مناسب رویہ اختیار کرلیا ہے تو پھر اُن کا سیاسی مسائل میں اُلجھنا، تضیعِ اوقات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جناح نے وقت کا انتظار کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ جب عدم تعاون اور خلافت، دونوں تحریکیں ناکام ہوئیں تو وہ نومبر ۱۹۲۳ میں مرکزی اسمبلی میں داخل ہوئے۔ وہاں ۲۰ آزاد ممبروں کے گروپ لیڈر کی حیثیت سے انھوں نے موتی لال نہرو کے ۴۲ ممبروں پر مشتمل، سوراج پارٹی سے تعاون کیا۔ جناح بلاشبہ ایک عظیم نیشنلسٹ تھے جن کی قیادت کا اعتراف صرف مسلمانوں کے ترقی پسند طبقے ہی کو نہیں، بلکہ اسے ہندوؤں کی بڑی تعداد بھی تسلیم کرتی تھی۔

نان کوآپریشن اور خلافت تحریک کے زمانے میں یعنی ۱۹۲۱ سے ۱۹۲۴ تک مسلم لیگ ساکت اور بے جان سی رہی لیکن جیسے ہی یہ تحریکیں ڈھیلی پڑیں، مسلم لیگ میں زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ سن ۱۹۲۴ میں مسلم لیگ کا پندرھواں اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس موقع پر جناح نے لوگوں کو بتایا کہ اگرچہ نان کوآپریشن تحریک ناکام رہی، اس سے کافی نقصان پہنچا لیکن کچھ فائدے بھی ہوئے۔ عوام

بیدار ہوگئے ہیں اور اب وہ سوراج کا مطالبہ کر رہے ہیں - فوری طور پر ان کی مانگ "ذمّہ دار ڈومینین" حکومت کی ہے - اس مطالبے کے حصول کی خاطر اُن میں ایک طرح کی بے خوفی آچکی ہے - ہندوستان کے عام آدمی میں سیاسی شعور پیدا ہو چلا ہے چنانچہ اب وہ سمجھنے لگا ہے کہ اس کی خودداری اور عزّت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس ملک کی باگ ڈور غیروں کے بجائے خود ملک کے لوگوں کے ہاتھ میں ہو - جناح نے یہ بھی بتایا کہ لیگ اعلان کر چکی ہے کہ اس کا مقصد ملک کے لیے سوراج حاصل کرنا ہے - اب تک ملک میں بدیسی حکومت اس لیے جمی ہوئی تھی کہ ہندو اور مسلمان آپس میں مُتحد نہیں تھے - جس دن ان میں اتحاد ہو جائے گا اسی روز ہندوستان کو ذمّہ دار ڈومینین حکومت مل جائے گی - ہندوستان کے دستور کے لیے جناح نے دو بنیادی اصول پیش کیے جن کی بدولت، دستور (ان کے خیال میں) مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکے گا :-

(الف) دستور وفاقی (فیڈرل) طرز کا ہو جس کی رو سے صوبوں کو خود مختاری حاصل ہو - مرکزی حکومت کا تعلق صرف عام مسائل تک باقی رہے -

(ب) ہر صوبے میں اقلیتوں کو معقول اور مؤثر نمائندگی دی جائے اور جو سر دست جُداگانہ انتخابات کے ذریعے ہو -

جناح نے ۱۹۱۹ء کے مانٹیگ ایکٹ پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ایکٹ ناکافی اور قطعی تسلی بخش نہیں ہے، اس لیے پوری کوشش کی جانی چاہیے کہ ملک میں مکمل ذمّہ دار حکومت قائم ہو - اس کے بعد

۱۳ر جولائی ۱۹۲۵ کو جناح نے جیکر کو یہ خط لکھا:-

"میری رائے میں یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ الزام سوراج پارٹی کے سر تھوپا جا سکے۔ اگر حکومت کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ چونکہ سوراج پارٹی تعاون نہیں کر رہی ہے اس لیے وہ بھی کچھ نہیں کر سکتی ہے، تو یہ بڑے افسوس کی بات ہوگی۔ آپ کو چاہیے کہ صاف صاف کہہ دیں کہ سوراج پارٹی تعاون کرنے پر آمادہ ہے اور چاہے موجودہ آئین میں کچھ خرابیاں ہی کیوں نہ ہوں وہ اس کے تحت ذمّہ داری بھی سنبھالنے کے لیے تیار ہے۔ شرط اتنی ہے کہ حکومت فوراً اس کا اعلان کر دے کہ آئین پر نظرِ ثانی کرنے اور ترمیم کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے گا جس کے ارکان ایسے ہوں گے جو ہمارے ملک کے لیے قابلِ قبول ہوں گے اور اُن کو قوم کا اعتماد حاصل ہوگا۔

جب برکن ہیڈ[1] نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ گورنمنٹ، سکریٹری آف اسٹیٹ اور مقرر کردہ رائل کمیشن اُن تمام تجویزوں اور اسکیموں پر غور کرے گا جنھیں لوگوں کی حمایت حاصل ہوگی، تو اس وقت میرے خیال میں، انھیں یہ توقع ہوگی کہ ہم لوگ کسی ایک اسکیم پر رضامند ہی نہ ہوں گے۔ اس لیے اس معاملے پر زور نہیں دیا جائے گا۔ لیکن ہم کو حکومت سے ان مطالبات پر اصرار کرنا ہے:-

(الف) اس بات کا صاف اعلان کہ آئین میں ترمیم کی جائے گی۔

(ب) شاہی کمیشن فوراً مقرر کیا جائے۔

---

[1] اس وقت کے وزیر ہند۔

(ج) کمیشن کے ارکان قابلِ اعتبار ہوں۔

اس کے ساتھ ہی اپنی طرف سے ہم اعلان کر دیں کہ اس دوران میں ہم موجودہ آئین کے تحت کام کرنے کے لیے تیار ہیں گو کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ناقص ہے اور اس سے خاطر خواہ فائدے حاصل نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ جب ایسا سمجھوتا ہو چکے تو پھر سوراج پارٹی وزارت بنائے۔ بنگال اور سی۔پی کے سیاسی قیدی رہا کر دیے جائیں۔ اس طرح آئین پر نظرثانی کرنے کے لیے، تعاون اور باہمی مصالحت کی فضا تیار ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا گیا تو میرے خیال میں وہ اتنی ہی بڑی غلطی ہوگی جیسی کہ سن ۲۲-۱۹۲۱ میں گاندھی جی نے گول میز کانفرنس کی تجویز کو رد کر کے کی تھی۔ مجھے امید ہے کہ سوراج پارٹی اپنے آپ کو دوسری پارٹیوں کی طرح نکمی بنا کر نہیں رکھے گی۔"

جناح کی وصیت

سن ۱۹۲۶ میں کلکتہ سے ایک کتاب چھپی تھی جس میں ہندوستان کی مشہور کمپنیوں کے نام اور اُن کے بڑے بڑے حصے داروں کے نام تھے۔ جناح کا نام تین کمپنیوں کے تحت درج تھا: ٹاٹا اسٹیل، بمبئی ڈائنگ اور ٹراموے کمپنی۔ ان تینوں میں اُن کے چودہ لاکھ روپے کے حصے تھے۔ یہ سرمایہ اُس وقت کی قیمتوں کے لحاظ سے ہے، ظاہر ہے کہ پچھلے برسوں میں یہ سرمایہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوگا۔ جناح سٹے یا قسمت آزمائی کے بیوپار یا مشغلے کے بالکل قائل نہ تھے۔ وہ اپنا سرمایہ بڑی احتیاط کے ساتھ اور کافی سوچ بچار کے بعد کہیں لگاتے تھے۔ اُن کی وفات کے وقت ان کے ذاتی اثاثے کی قیمت

کروڑوں تک پہنچ گئی ہوگی۔ وفات کے بعد جب جناح کی وصیت پڑھی گئی تو معلوم ہوا کہ انھوں نے چھ لاکھ روپئے علی گڑھ یونی ورسٹی کے لیے چھوڑے ہیں، جس کے بارے میں اُن کے سوانح نگار ہیکٹر بولی تھو[1] نے بتایا کہ آج تک اس رقم کا مطالبہ نہ تو علی گڑھ نے کیا اور نہ حکومت ہند نے[2]۔ واضح رہے کہ جناح کی وصیت قیامِ پاکستان سے پہلے لکھی گئی تھی۔ کیا اس وصیت نامے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ جناح کو ہندوستان کے بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہونے کی ہرگز توقع نہ تھی؟

افواج کی ہندستانیت

فروری ۱۹۲۵ میں حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد افواج میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی عنصر داخل کرنے اور سینڈھرسٹ اکیڈمی کے نمونے پر فوجی کالج قائم کرنے کی سفارشات پیش کرنی تھیں۔ جناح اور موتی لال نہرو اس کمیٹی کے ارکان مقرر کیے گئے تھے۔ لیکن کچھ مہینوں کے بعد موتی لال نہرو مستعفی ہوگئے۔ جناح نے کمیٹی کی طرف سے شہادتیں جمع کرنے میں قانونی جرح کے وہ سارے گُر استعمال کیے جن کے وہ ماہر تھے۔ اُن کی جرح جن انگریز فوجی افسروں کو بہت ناگوار گزری، اُن میں ڈگلس گریسی بھی تھے، لیکن اس کے باوجود اس کام میں کہیں بھی کسی قسم کی تلخی پیدا نہ ہونے پائی۔

---

[1] Hector Boli tho

[2] اسی وصیت میں پچیس ہزار کی رقم انجمن اسلام، بمبئی کے لیے چھوڑی گئی تھی۔ یہ رقم مسلسل جدوجہد کے بعد انجمن نے ۱۹۶۰ میں حاصل کرلی۔ م۔م۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۸ میں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے جناح نے مسٹر ڈگلس گریسی ہی کو پاکستانی افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا۔

سن ۱۹۲۶ میں جناح اسکین (سینڈھرسٹ) کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے یورپ اور امریکہ بھی گئے تھے۔ رتی اُن کے ساتھ تھیں۔ دہرہ دون کا فوجی کالج اسی کمیٹی کی سفارشات کا نتیجہ ہے۔

اصلاحی کاروائیاں

ملک کے مختلف مسائل کے بارے میں جناح کا رویہ ہمیشہ ترقی پسندانہ اور اصلاحی رہا ہے۔ لیبر اور سماجی اصلاح (سوشل ریفارم) پر اسمبلی میں جتنے بل پیش ہوئے اُن سب کی جناح تائید کرتے رہے۔ انھوں نے ایام زچگی میں اُجرت دیے جانے کی حمایت کی اور شادی کی رضامندی کی عمر بڑھانے کی تجویز کی تائید کی۔ واقعہ یہ ہے کہ جناح نہ تو سیاست میں رجعت پسند رہے اور نہ معاشرتی اصلاح کے معاملے میں کبھی کسی سے پیچھے رہے۔

بے نظیر انتخاب

۱۹۲۶ میں مرکزی اسمبلی کی مُسلم نشست کے لیے جناح بمبئی سے کھڑے ہوئے۔ انھیں اپنی کامیابی کا اس قدر یقین تھا کہ انھوں نے کوئی انتخابی مہم شروع نہیں کی۔ اس سے ہم تینوں ــ رتی، سر پرشوتم داس ٹھاکر داس اور میں ــ سخت پریشان تھے۔ ہم جب کبھی جناح کو اس کی ضرورت محسوس کرانے کی کوشش کرتے، وہ بڑی بے نیازی سے جواب دیتے: "بھئی، یہ تو اصل میں ووٹروں کی آزمائش ہے، میں کیوں فکر کروں؟" اس خود اعتمادی پر ہم لوگوں کو ہنسی آجاتی مگر عین الیکشن کے دن جو سماں دیکھنے میں آیا وہ مجھے ہمیشہ

یاد رہے گا۔ جناح کے کچھ کہے سُنے بغیر، اُن کے ہندو دوستوں نے تقریباً ایک سو موٹریں بھیج دیں تاکہ اُن میں ووٹر ٹاؤن ہال اور عمر کھاڑی کے پولنگ اسٹیشن تک پہنچ جائیں[۱]۔ جناح کے اُن ہندو دوستوں نے انھیں خطوط بھی لکھے جن میں کہا گیا تھا کہ چونکہ انتخاب فرقہ وارانہ بنیاد پر ہو رہا ہے، اس لیے وہ ووٹ تو نہیں دے سکتے، لیکن اپنی گاڑیاں بھیج کر اگر وہ جناح کو کامیاب کرانے میں مدد دے سکتے ہیں تو یقیناً یہ مادرِ وطن کی ایک خدمت ہوگی۔ اس داستان کا بقیہ حصّہ "بمبئی کرانیکل" کی اِشاعت مورخہ ۵ نومبر ۱۹۴۵ میں یُوں بیان ہوا ہے:

"بمبئی کرانیکل کی اشاعت مورخہ ۳ نومبر میں "بیربل" کے نوٹ میں کچھ غلط باتیں چھپی ہیں جن کی تصحیح چاہتا ہوں۔ بیربل نے لکھا ہے کہ تقریباً بیس سال ہوئے مسٹر حسین بھائی لالجی نے جو جناح صاحب کے مقابلے میں مرکزی اسمبلی کے لیے کھڑے ہوئے تھے، اپنی امیدواری واپس لے لی تھی حالانکہ وہ کامیاب ہو رہے تھے۔ یہ سراسر غلط ہے واقعہ یہ ہے کہ اُس موقع پر تین امیدوار تھے ـــــ مسٹر جناح، مسٹر صالح بھائی بڑودہ والا اور مسٹر حسین بھائی لالجی۔ پولنگ کے دن دس بجتے بجتے صاف ظاہر ہونے لگا کہ میدان کس کے ہاتھ رہے گا کیونکہ جہاں جناح صاحب کو دس ووٹ مل رہے تھے، بقیہ دو اُمیدواروں کو چار ملتے تھے۔ دوپہر کے قریب مسٹر بڑودہ والا نے

۱؎ اُس زمانے میں گاڑیاں استعمال کرنے کی اجازت تھی ـــ م

جناح صاحب سے کہا کہ اگر وہ (جناح صاحب) اُن سے اپنی امیدواری واپس لینے کو کہیں تو وہ بڑی آسانی سے اُن کی بات مان لیں گے۔ جناح صاحب نے نہایت نرمی سے جواب دیا کہ اُن کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ بڑودہ والا سے نام واپس لینے کی درخواست کریں۔ اگر بڑودہ والا آخری لمحے تک بھی مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں تو وہ شوق سے ایسا کر سکتے ہیں۔ اس جواب کے آدھ گھنٹے بعد بڑودہ والا انتخاب سے دستبردار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جب دوسرے فریق یعنی مسٹر حسین بھائی لالجی نے دیکھا کہ جناح صاحب کو کہیں زیادہ ووٹ مل رہے ہیں تو انھوں نے بھی یہی خواہش ظاہر کی۔ جناح صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ مقابلہ جاری رکھیں۔ سہ پہر تک ووٹ پڑتے رہے۔ آخر جناح صاحب اپنے دونوں حریفوں کے مقابلے میں بھاری اکثریت سے جیت گئے۔"

مخلوط انتخاب

سن ۱۹۲۷ میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ میں بُنیادی زور مخلوط انتخاب پر تھا۔ مارچ میں نئی دلّی میں کئی پرائیوٹ جلسے ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر بھی مسلم زعماء کے کئی جلسے ہوئے۔ اس کے بعد بیس مختلف الخیال مسلم لیڈروں کا ایک جلسہ ہوا جس میں راجہ صاحب محمود آباد، سر محمد شفیع، سر عبدالقیوم، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، راجہ غضنفر علی خاں اور مولانا محمد یعقوب شریک تھے۔ جناح نے جلسے کی صدارت کی۔ انھوں نے جلسے کو بتایا کہ کانگریس کے صدر سری نواس آئنگر کی طرف سے پانچ تجویزیں موصول ہوئی ہیں، جو سب کی سب مخلوط انتخاب کی بنیاد پر ہیں۔ بحث کے بعد جلسے نے چند شرائط کے ساتھ

مخلوط انتخاب کی بات منظور کرلی اور یہ تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوگئی:
"کسی بھی مجوزہ دستور کے مرتب کرنے میں، نمائندگی کے طریقۂ کار کے سلسلے میں حسب ذیل شرطیں، سمجھوتے کے طور پر مان لی جائیں:
(الف) سندھ کو بمبئی پریسی ڈنسی سے الگ کرکے ایک علاحدہ صوبہ بنادیا جائے۔
(ب) شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کو عام صوبوں کی سطح پر لایا جائے۔ ایسی صورت میں ہم ان صوبوں میں مخلوط انتخاب کا طریقۂ کار منظور کرلیں گے اور اس کے ساتھ مسلمان یہ بھی مان لیںگے کہ بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہندو اقلیت کو وہی مراعات دیں گے جو مسلمان اقلیت کو ہندو اکثریت کے صوبے اپنے یہاں دیں گے۔ پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ البتہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی تعداد سے کم نہ ہونی چاہیے اور وہ بھی مخلوط انتخاب کے ذریعہ۔
"ان تجویزوں کی مسلمان پارٹیاں تو اپنی اپنی جماعت میں توثیق کریںگی لیکن حاضرالوقت ارکان توقع کرتے ہیں کہ ہندو انھیں قبول کریں گے، مسلمان بھی ان کی توثیق کریں گے۔"

دوسرے دن کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور اس کا ردّعمل اس تجویز کے موافق ہوا، چنانچہ سری نواس آئنگر، موتی لال نہرو، سروجنی نائیڈو اور مولانا محمد علی پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی کہ وہ مسلم کانفرنس اور ہندو فرقے کے نمائندوں سے مل کر تفصیلات طے کرلے۔
جناح ایک سچے اور عظیم نیشنلسٹ تھے۔ انھوں نے مختلف خیال

مسلم لیڈروں کو ہموار کر کے ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کی نہایت مخلصانہ اور جان توڑ کوشش کی۔ ان کوششوں کی خاطر مذہبی، ہندوستان کی بہبودگی کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ کامیاب ہوتے۔ دشواریوں کے باوجود اُمید کی کرن دکھائی دینے لگی۔ ٹھوس تجویز سامنے تھی۔ لیکن افسوس کہ بعض شرپسند قوتوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

تخریبی کارروائی

"ٹائمز آف انڈیا" میں ایک ہفتہ وار فیچر مضمون "مسلمانوں کی نظر سے" کے عنوان سے نکلا کرتا تھا۔ اس فیچر میں جناح کی کوششوں کے بارے میں بعض نہائت غیر معروف اور گھٹیا قسم کے اُردو اخباروں کے مضامین کے حوالے چھاپے جاتے تھے۔ اگرچہ ان اُردو اخباروں کی عوام میں کوئی وقعت نہ تھی لیکن اُن کے مضامین گورنمنٹ کے اورینٹل ٹرانسلیٹر کے محکمے سے ترجمہ کرا کے ٹائمز آف انڈیا کو بھیجے جاتے۔ ذاتی علم کی بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے گورنمنٹ کا مقصد مذہبی عناد پیدا کرنا اور فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دوسری طرف کانگریسی اخبار "بمبئی کرانیکل" نے جناح کے خلاف یہ لکھ کر الگ محاذ قائم کیا کہ وہ پکے فرقہ پرست ہیں۔ میں نہائت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جناح ہرگز فرقہ پرست نہیں تھے۔ کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی بڑے نرم طبیعت اور مرنجان و مرنج انسان تھے لیکن کانگریسی ہائی کمان کی خوشنودی کی خاطر انھوں نے جناح پر رکیک حملے کیے اور ایسے ذلیل الزامات لگائے

جن سے جناح کی شخصیت صرف مشتبہ ہی نہیں بلکہ مکروہ نظر آنے لگی - میں جانتا ہوں کہ اُن جھوٹے الزاموں سے جناح کو کتنا سخت صدمہ پہنچا تھا اور اُن کا رنجیدہ ہونا بالکل درست بھی تھا۔ اِن سب کا نتیجہ وہی نکلا جو رجعت پسند طبقہ چاہتا تھا اور جو حکومت چاہتی تھی -

سائمن کمیشن

۸ نومبر ۱۹۲۷ کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی سفارش پیش کرنے کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا ہے جس کے چیرمین سرجان سائمن ہونگے. اِس کمیشن کے سب ارکان انگریز تھے۔ اس نوعیت کے کمیشن کے بارے میں ہندوستان کا جو رویّہ ہونا چاہیے تھا وہ ظاہر ہے - میں مسز بیسنٹ کے ایما پر جناح سے ملا- انھوں نے ایک مختصر سا بیان تیار کر کے سارے ملک میں دوستوں کے پاس بھیج دیا- ایک نقل مجھے دے کر بولے کہ اس پر بمبئی کے بارہ مشہور لیڈروں کے دستخط چاہئیں- اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میں نے مطلوبہ دستخط حاصل کر کے شام تک ان کے پاس پہنچا دیا-

۱۶ کو وہ بیان جناح نے اخباروں میں شائع کرادیا- یہ بیان سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان تھا-جن لوگوں نے جناح کے تیار کیے ہوئے بیان پر دستخط کیے تھے اُن میں سر دنشاپیٹٹ، سر علی امام، سر چمن لال سیتلواد، سر عبدالرحیم، سر سی- پی- شیوسوامی آئر، سر تیج بہادر سپرُو، سر فیروز سیٹھنا، سر پرشوتم داس ٹھاکرداس، منشی ایشور شرن، یعقوب حسن، دیوان بہادر رنگا چاریہ، ڈاکٹر

شان مکھم چیٹی، محمد علی جناح، سرمن موہن داس راجی، ایچ - پی - مودی، مسز سروجنی نائیڈو، راجہ غضنفر علی خاں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، سی - وائی - چنتامنی، سچیدا نند سنہا، نواب اسماعیل خاں وغیرہ شامل تھے۔

لالہ لاجپت رائے اور جیکر نے علاحدہ بیان کے ذریعے اور اسی طرح دوسرے کانگریسی لیڈروں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔

مدراس میں کانگریس کا اجلاس ہوا اور کلکتے میں مسلم لیگ کا، دونوں میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی قراردادیں منظور ہوئیں۔ برطانوی لیبر پارٹی کے نمائندہ میجر گراہم پول دونوں اجلاس میں شریک ہوئے۔ ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ وہ لکھنؤ اجلاس (سن ۱۹۱۶) میں شریک ہوئے تھے اور سن ۱۹۲۷ کے مدراس سیشن میں بھی اور ان دونوں موقعوں پر ہندو مسلم سمجھوتے کے ماتحت اتحادِ عمل کا اظہار ہوا۔[1]

بعض حیثیتوں سے لکھنؤ کے مقابلے میں مدراس کا سمجھوتا زیادہ معنی خیز تھا۔ میجر پول نے یقین دلایا کہ لیبر پارٹی دل سے

---

[1] سن ۱۹۱۶ میں کانگریس لیگ معاہدہ ہوا تھا۔ اس موقع پر مسٹر سریندر ناتھ بینرجی نے یو۔پی۔ (یونائیٹڈ پراونسس) اور لکھنؤ کے ناموں پر رعایت لفظی سے کام لیتے ہوئے تقریر میں کہا تھا:

Now Hindus and Muslims are united in United Provinces; here is Luck- now - م

خواہشمند ہے کہ ہندوستان کو جلد از جلد سوراج حاصل ہو جائے۔ لیکن بائیکاٹ کے ایسے ہمہ گیر اعلانات کے باوجود سائمن کمیشن کا تقرر ہو گیا۔

رتی کی علاحدگی

جنوری ۱۹۲۸ میں کلکتہ مسلم لیگ کے اجلاس سے واپسی پر رتی اور جناح میں علاحدگی ہو گئی۔ میں اس کا ذمہ دار ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قرار نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی سبب تھا تو وہ صرف مزاج اور عمر کا فرق تھا۔ رتی کو انتقال کئے ہوئے ۳۵ سال گزر گئے لیکن میں ذاتی علم کی بنا پر آج بھی یہی کہوں گا کہ وہ آخری دم تک جناح سے محبت کرتی رہیں۔ ۳ اپریل ۱۹۲۸ کو جناح انگلستان گئے۔ اس کے ایک ہفتے بعد رتی بھی پہنچ گئیں۔ اُس سال اگست اور ستمبر کے درمیان رتی پیرس میں سخت بیمار پڑیں۔ اُس وقت میاں بیوی میں مفاہمت ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب جناح کو رتی کے نرسنگ ہوم میں داخل ہونے کی خبر ملی تو وہ فوراً پیرس پہنچے اور اُسی نرسنگ ہوم میں مقیم ہوئے۔ بعد میں مجھے رتی نے بتایا کہ جناح وہیں بیٹھ کر کھانا کھاتے اور وہی پرہیزی غذا کھاتے جو رتی کے لیے پکائی جاتی۔ اس کے بعد رتی اپنی ماں کے ساتھ ہندوستان لوٹیں، جناح بھی واپس آ گئے۔ رتی پوری طرح اچھی نہ ہو پائیں اور ۲۰ فروری ۱۹۲۹ کو اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں اُن دنوں اُن سے تقریباً روزانہ ملتا تھا۔

نہرو کمیٹی

دسمبر ۱۹۲۷ کے مدراس سیشن کے بعد کانگریس نے موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک سب کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد

ہندوستانی دستور کے بنیادی اُصول طے کرنا تھا۔ اس کے ارکان میں مسلمانوں میں سے سر علی امام اور شعیب قریشی تھے۔ ہندو سبھا سے اَنے اور جیکر، سکھ لیگ کے منگل سنگھ تھے اور ان سب کے علاوہ سر تیج بہادر سپرو، این۔ ایم۔ جوشی اور جی۔ آر۔ پردھان تھے۔ کمیٹی کے سکریٹری جواہر لال تھے۔ چونکہ جناح اپریل کے اوائل ہی میں انگلستان چلے گئے تھے اس لیے ان کی شمولیت کا سوال ہی نہ تھا۔

اَقلیت کا مسئلہ

نہرو کمیٹی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اقلیت کا تھا۔ جمہوری خود مختار ہندوستان میں اقلیت اور بالخصوص مسلمانوں کی حیثیت کیا ہونی چاہیے؟ ملک میں ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی۔ ایسی صورت میں اِس بات کا تحفظ ضروری معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی سامراج کی جگہ ہندوستانی جمہوریت قائم ہو جانے پر ہندوؤں کی مستقل اکثریت کہیں مسلم اقلیت کے مفاد کے خلاف کام نہ کرے۔ ایسے تحفظ کا ایک ممکن طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے جُداگانہ انتخاب کا اصول قائم رکھا جائے۔ لیکن یہ کوئی مستقل حل نہیں تھا۔ اس لیے دوسرے طریقوں پر بھی غور کرنا ضروری تھا۔

نہرو رپورٹ

نہرو کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ مرتب کر لی تو اس پر غور کرنے کے لیے اگست ۱۹۲۹ لکھنؤ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں کانگریس کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ، مرکزی خلافت کمیٹی، ہندو مہا سبھا اور بہت سی سیاسی اور اقلیتی جماعتیں شریک ہوئیں۔

ڈاکٹر انصاری کانفرنس کے صدر تھے۔ جناح کے رفیقِ کار راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی تقریر میں ۱۹۱۶ کے کانگریس اور لیگ کے معاہدے کا

ذکر کیا اور اُمید ظاہر کی کہ اس کانفرنس میں بھی وہی جذبہ کارفرما ہوگا اور نہرو رپورٹ کو ہر جماعت کی تائید حاصل ہو جائے گی ــــ لالہ لاجپت رائے، مولانا ابوالکلام آزاد، مدن موہن مالویہ، مولانا شوکت علی، مسز اینی بیسنٹ، محمد یعقوب، سروجنی نائیڈو اور جے۔ ایم۔ سین گپتا نے بھی نہرو رپورٹ کو سراہا۔ اس کانفرنس میں پنڈت مالویہ نے یہ تجویز پیش کر دی کہ حکومتِ برطانیہ سے ہندوستان کو فوراً ڈومینین کا مرتبہ دے کر ذمّہ دار حکومت بنانے کا مطالبہ کیا جائے۔ اس تجویز میں جواہر لال اور ان کے کچھ دوسرے ساتھی ڈومینین کے بجائے مکمل آزادی کا لفظ چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اختلافی تقریر کی۔

۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ کو کلکتے میں آل انڈیا کنونشن ہوا۔ اس میں نہرو رپورٹ کو آخری شکل دی جانے والی تھی۔ اجلاس میں مختلف سیاسی اور فرقہ وارانہ جماعتوں کے نمائندے شامل ہوئے ــ جس فرقہ وارانہ مسئلے کا حل نہرو رپورٹ نے تلاش کیا تھا، اسی کو دوبارہ تازہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ آغاخان اس رپورٹ کے مخالف تھے۔ جناح چونکہ اپریل سے اکتوبر تک ہندوستان سے باہر رہے اس لیے رپورٹ میں اُن کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ دراصل رپورٹ موتی لال نہرو اور سرتیج بہادر سپرو کی تیار کی ہوئی تھی۔ جناح کلکتہ کے اجلاس میں موجود تھے۔ وہیں اُنھوں نے مسلم لیگ کی طرف سے فرقہ وارانہ مسئلے کو اُٹھایا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کے لیے ہوں اور صوبوں کو باقی اختیارات حاصل ہوں۔

اس مطالبے پر غور کرتے ہوئے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُن

دنوں مسلم لیگ کا رویہ کانگریس سے مخالفانہ نہیں بلکہ دوستانہ تھا۔ مسلم لیگ رجعت پسند نہیں تھی - ایسی حالت میں کلکتہ کونشن کے موقع پر فرقہ وارانہ مسئلے کو اُٹھائے جانے کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی کہ ڈومینین کے بجائے مکمل آزادی کے مطالبے کی - بسری تواس آئنگر نے وہ بیان پڑھ کر سنایا جس پر اُن کے علاوہ جواہر لال نہرو، سبھاس چندر بوس اور ستیا مورتی نے دستخط کیے تھے اس بیان میں صاف صاف کہا گیا تھا "ہم مجوزہ دستور کے اس حصّے سے قطع تعلق کرتے ہیں جس سے ڈومینین حکومت کا قبول کرنا ظاہر ہوتا ہے" اس پر مسز بیسنٹ اور سی۔ پی۔ راما سوامی آئر نے ڈومینین حکومت کے حق میں تقریریں کیں - سر تیج بہادر سپرو نے باہمی اتحاد کی ضرورت پر ایک زبردست تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ وہ جناح کے ایک تہائی کا مطالبہ منظور کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن جیکر نے جناح کی ترمیم کی مخالفت کی جس کا اثر بالآخر یہ ہوا کہ آخری ووٹنگ میں جناح کی ترمیم رد ہوگئی۔

جناح کی تقریر

اپنی ترمیم کی تائید میں جناح نے بڑی مصالحانہ اور موثر جوابی تقریر کی جس میں انھوں نے کہا تھا:

"اس مسئلے پر میں آپ کے سامنے ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے تقریر کررہا ہوں"[1]

---

[1] سن ۱۹۱۲ میں کراچی کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: نہ میں مسلم ہوں نہ ہندو میں ایک ہندوستانی ہوں، اوّل بھی اور آخر بھی — م

آپ کو یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ ہندوستان میں دو اہم فرقے بستے ہیں — ہندو اور مسلمان - یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان دونوں میں اتحاد اور مفاہمت ہونی چاہیے' جس کی خاطر انھیں یہ محسوس کرانا ضروری ہے کہ اُن کے مفاد مشترک ہیں اور انھیں شانہ بہ شانہ آگے بڑھنا ہے۔"

جناح اقلیت کے لیے ضمانت چاہتے تھے، انھوں نے کہا:

"ہم سب اسی زمین کی اولاد ہیں؛ ہمیں ایک ساتھ رہنا ہے' ہمیں ایک ساتھ کام کرنا ہے، ہمارے آپس کے اختلافات کیسے بھی ہوں' اُن سے دشمنی پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے اس سے زیادہ اور کسی بات سے خوشی نہیں ہو سکتی کہ میں ہندو اور مسلمانوں کو متحد دیکھوں۔"

نہرو رپورٹ کا انجام

آل انڈیا کنونشن کا جو انجام میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اُس کا حال میں نے "انڈین سوشل ریفارمر" میں اپنے مراسلے مورخہ ۸ جنوری ۱۹۳۳ میں یُوں بیان کیا تھا:

"نہرو رپورٹ" کو "نہرو" رپورٹ کا نام دیا جانا ہی اس کی بدقسمتی تھی - اس سے ذاتی مخاصمت اور حسد کی آگ بھڑک اُٹھی - میں کلکتے میں دسمبر ۱۹۲۸ کے اُس جلسے میں مسز بیسنٹ کے ساتھ پلیٹ فارم پر بیٹھا تھا، جس میں آل انڈیا پارٹیز نے نہرو رپورٹ پر بحث شروع کی تھی - گاندھی جی، مسز بیسنٹ، سپرو، جناح، سی - پی - راما سوامی آئر، سروجنی نائیڈو، جیکر یہ سب وہاں موجود تھے - رپورٹ نے ہندو مسلمان کا سمجھوتا بھی طے کر دیا تھا۔ بھری تو اس آنگر ڈومینین حکومت کے بجائے مکمل آزادی کے

مطالبے کے حق میں تھے - لیکن اس میں اُصول سے زیادہ ذاتیات کو دخل تھا - گاندھی جی یہ جانتے تھے کہ مکمل آزادی سے متعلق سری نواس آئنگر کی ترمیم کی بنیاد اُن کی موتی لال کی مخالفت تھی، پھر بھی وہ سری نواس آئنگر کے ہمنوا ہو گئے اور موتی لال نہرو نہرو، جناح اور مسز بیسنٹ سے مشورہ کیے بغیر انھوں نے آئنگر سے سمجھوتا کر لیا کہ اگر ہندوستان کو سن ۱۹۲۹ تک ڈومینین حکومت کا درجہ حاصل نہیں ہوا تو وہ مکمل آزادی کا مطالبہ ضرور پیش کریں گے۔ گاندھی جی کے اس سمجھوتے سے نہرو، مسز بیسنٹ، جناح وغیرہ کافی چیں بہ جبیں ہوئے لیکن ان کے اثرات کے تحت مجبور ہو گئے - اس کے بعد جیکر نے فرقہ وارانہ مصالحت کی تجویزوں کی مخالفت کی جس کے ساتھ نہرو رپورٹ کا خاتمہ ہو گیا......"

آل پارٹیز کنونشن کے فوراً بعد کانگریس کا اجلاس موتی لال نہرو کی صدارت میں ہوا جس نے نہرو رپورٹ کے سارے اچھے پہلوؤں پر پانی پھیر دیا - کانگریس نے اپنے آپ کو دوسری پارٹیوں سے بے نیاز کر لیا اور اس طرح باہمی تعاون کے لیے کانگریس کے دسمبر ۱۹۲۷ کے مدراس سیشن میں مسلم لیگ نے جو ہاتھ بڑھایا تھا وہ جھٹک دیا گیا۔

مسز جناح کی علالت

ہندوستان کی تاریخ میں گاندھی جی، ولبھ بھائی پٹیل اور جواہر لال نہرو کے ساتھ ساتھ سن ۱۹۲۹ سے ۱۹۴۷ تک محمد علی جناح کا بھی بڑا اہم رول رہا ہے، اس لیے چاہتا ہوں کہ یہاں اُن کے کچھ ذاتی حالات بھی بیان کروں۔

جنوری اور فروری ۱۹۲۹ میں رتی بیمار رہیں جس کی وجہ سے

وہ بڑی پژمردہ رہا کرتی تھیں۔ جناح ہر روز شام کے وقت اُن سے ملنے جایا کرتے تھے۔ اور جب میں ان دونوں کے ساتھ ہوتا تو بیتے دنوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اب جناح اور رتی باہمی مفاہمت کی طرف آ رہے تھے۔ گو آل پارٹیز کانفرنس، فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہی تھی لیکن جناح کو اس سے زیادہ تردد نہیں ہوا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ایک نہ ایک دن مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتا ہو جائے گا۔

۱۷ فروری کی صبح کو میں مسز بیسنٹ کے استقبال کے لیے اسٹیشن گیا، دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھا کر گھر پہنچا تو رتی آگئیں۔ وہ بے حد ملول اور بجھی بجھی سی تھیں۔ تقریباً چار گھنٹے میرے گھر رہیں۔ میں نے اُن کے لیے چائے بنائی۔ اُن کی حالت دیکھتے ہوئے انھیں تنہا چھوڑنا مناسب نہ تھا، اس لیے شام کی چائے کے لیے میں مسز بیسنٹ کے یہاں بھی نہ جا سکا۔ سات بجے کے قریب میں نے رتی کو اُن کے گھر چھوڑا اور وعدہ کیا کہ مسز بیسنٹ سے ملنے کے بعد سوا دس بجے رات تک اُن کے پاس آجاؤں گا۔ لیکن جب میں وہاں رات کو پہنچا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ رتی بیہوش پڑی تھیں۔ کچھ دیر بعد انھیں ہوش آیا۔ دوسرے دن یعنی ۱۸ فروری کی صبح کو فون ملا کہ دفتر جاتے ہوئے اُن سے ملتا جاؤں۔ اُس دن وہ بے حد افسردہ نظر آئیں۔ کچھ تو اُن کی دلبستگی کی خاطر اور کچھ انھیں خوش کرنے کیلیے میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور "اچھا اب میں رات کو پھر ملونگا" کہہ کر ان سے رخصت ہونے لگا تو انھوں نے بڑی افسردگی سے

جواب دیا: "اگر زندہ رہی تو! ورنہ دیکھو میری اِن بلیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا۔ کسی اور کو نہ دے دینا!" رتی کے یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سُنے۔ میں رات کے کھانے پر اندھیری میں ایک جگہ مدعو تھا۔ وہاں سے سوا گیارہ بجے لوٹا تو سیدھا رتی کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہیں۔ میں بھی دو راتوں سے سو نہیں پایا تھا، اپنے گھر چلا آیا۔

رتی کی وفات

اگلے دن سہ پہر کو فون پر اطلاع ملی کہ رتی پھر بے ہوش ہو گئی ہیں اور جینے کی کوئی امید باقی نہیں ہے۔ میں اُسی وقت اُن کے گھر گیا لیکن انھیں دیکھ نہ سکا۔ ۲۰ فروری کو رتی کی سالگرہ تھی لیکن ٹھیک اُسی تاریخ کو وہ اس دنیا سے چل بسیں۔ جناح اُن دنوں دِلّی میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن میں مصروف تھے۔ بڑی مشکل سے ۲۲ فروری کو بمبئی پہنچ پائے۔ گرانٹ روڈ پر کرنل سوکھے، اُن کی بیوی اور میں جناح کو لینے گئے۔ اس وقت سے لے کر تجہیز و تکفین تک یعنی پورے پانچ گھنٹے میں جناح کے ساتھ رہا۔ میرا خیال تھا کہ خود رتی دفن کئے جانے کے بجائے (ہندوؤں کے طریقے سے) جلائی جانا پسند کرتیں۔ یہ بات میں نے جناح سے بھی کہی لیکن وہ نہ مانے اور اسلامی طریقے سے تدفین کا انتظام کیا گیا۔ سارا وقت جناح بڑے ضبط اور ہمّت سے کام لیتے رہے۔ کچھ دیر تو خاموش رہے پھر انھوں نے یکایک بڑی روانی کے ساتھ اسمبلی کی کارروائیوں کا ذکر کرنے لگے۔ وہ اسمبلی کے اسپیکر وِٹھل بھائی پٹیل کا ذکر کر کے کہنے لگے کہ کس طرح وہ حکومت کے خلاف ایک پیچیدگی میں پڑ گئے تھے اور پھر کیسے انھوں نے وِٹھل بھائی

کی دستگیری کی - اور دوسری باتوں کا بھی ذکر کرنے لگے - لیکن یہ بات چھپ نہیں رہی تھی کہ جناح کا دل رو رہا ہے اور وہ بے محل گفتگو چھیڑ کر اپنے جذبات کو چھپانے کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں - یہ سب اسی وقت تک ہوتا رہا جب تک جنازہ قبر کے پاس رکھا تھا، لیکن جونہی رتی کی لاش قبر میں اُتاری گئی اور جناح سے مٹی دینے کو کہا گیا تو ضبط کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دیر تک بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے - میں نے بھی اُن کا ساتھ دیا اور اُمڈتے ہوئے آنسوؤں اور بوجھل دل کے ساتھ رتی کی حسین روح کے بے جان جسم کا دیدار کیا - میں نے رتی سے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن اُس کی پوری کہانی لکھوں گا، وہ وعدہ میں تیس برس کے بعد پورا کر رہا ہوں[1]

رتی کے بعد

رتی کی وفات کے بعد میں نے جتنی تلخی اور افسردگی جناح کی زندگی میں دیکھی اس سے پہلے کسی اور شخص میں نہیں پائی تھی - میرے سامنے اُنھوں نے گویا اپنا دل نکال کر رکھ دیا - دو گھنٹے تک وہ مسلسل بولتے رہے اور میں سُنتا گیا - بیچ میں کبھی دو ایک لفظ ہمدردی کے کہہ دیتا - ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جناح کی کمر ٹوٹ گئی ہو - جناح کے لیے بیوی کی موت صرف ایک المناک سانحہ یا مرضیِ مولا کا کرشمہ ہی نہیں تھا بلکہ اس میں انھیں اپنی ناکامی کی جھلک نظر آتی تھی ؛ زندگی میں ذاتی شکست محسوس ہونے لگی تھی - میرا خیال ہے کہ وہ اس صدمے کو اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بُھلا نہ سکے -

---

[1] دیکھو میری تصنیف Ruttie Jinnah

حزن و تنہائی

جناح کی ذاتی اور سیاسی زندگی ممکن حد تک صاف ستھری، پاکیزہ اور ہر طرح سے بے لوث رہی۔ انھوں نے ۱۹۱۶ میں ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر اُنیسویں صدی کے طرز کا بنا ہوا بنگلہ "ساؤتھ کورٹ" خریدا تھا۔ اُن کی شادی کے بعد سے یہ مکان میرے لیے بھی اپنا ہی گھر بن چکا تھا۔ اس کی چھتوں کے نیچے مجھے رتی اور جناح کی دوستی اور اعتماد ملا۔ بمبئی میں جناح میرے لیے سیاسی لیڈر بھی تھے اور دوست بھی۔ میرے دل میں اُن کی انتہائی عزت تھی۔ سن ۱۹۱۸ میں شادی کے بعد جناح کی ازدواجی زندگی بڑی دلنواز رہی۔ وہ رتی سے بڑی حد تک اِنسپیریشن حاصل کرتے تھے۔ ان کی ذاتی اور سوشل زندگی ہی نہیں بلکہ سیاسی زندگی بھی رتی کے ساتھ ساتھ گذری۔ رتی اُن کے ساتھ رہا کرتی تھیں اور اپنے شوہر کو ہر طرح سے بے فکر اور پُرکیف بنائے رکھتی تھیں۔ شادی کے بعد جناح نے اورینٹ کلب سے (جہاں وہ شطرنج اور بلیرڈس کھیلا کرتے تھے) استعفا دے دیا۔ انھیں تاش سے کبھی رغبت نہیں رہی۔ قسمت آزمائی کی تفریح سے اُنھیں سخت نفرت تھی۔ رتی کی موت نے اُنھیں بالکل تنہا کر دیا تھا۔ وہ اس تنہائی سے بچ نہ سکتے تھے۔ اِس کیفیت نے اُن کی زندگی میں تلخی پیدا کر دی تھی۔ اور مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ ان کے ذاتی نقصان سے پیدا شدہ یاس و حزن کی تلخی اُن کی سیاسی زندگی میں بھی داخل ہو گئی تھی۔ بیوی کی موت کے اُنیس برس بعد تک یہ حالت باقی رہی اور اس نے اُن کی سیاست کو بھی متاثر کیا۔ یہ سارے واقعات ایک دردناک داستان کے افسوسناک باب ہیں۔

مزاج میں تبدیلی رتّی کے بعد جناح تنہائی پسند ہوکر گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ ایک وقت تھا کہ وہ شگفتہ مزاجی اور شائستگی کے نمونہ تھے لیکن اب اُن کی شخصیت میں انانیت کے حلقے پڑنے لگے تھے، تنقید شاق گزرنے لگی، طنز، دُشنام طرازی، غلط فہمی اور غلط بیانی برداشت سے باہر ہونے لگی۔ اگر کسی نے غلطی سے یا غیر ارادی طور پر کوئی ایسی بات کردی تو اُنھوں نے اُسے کبھی معاف نہیں کیا۔ رتّی کی موت کا اثر اُن پر غیر معمولی حد تک پڑا تھا۔ اپنی زندگی کے بقیہ اُنّیس سال میں اُنھوں نے اُس کا نہ تو کبھی نام لیا اور نہ اُس کا کوئی ذکر آنے دیا۔ یہاں تک کہ ان کے گھر میں اس کی کوئی تصویر بھی نہ تھی۔ رتّی نے بڑے شوق سے یشب کی بنی ہوئی چیزوں کے نایاب نمونے جمع کیے تھے۔ اُس کے پاس کتابوں کے بعض نادر پہلے ایڈیشن تھے۔ یہ سب چیزیں میوزیم کی زینت بن سکتی تھیں۔ لیکن جناح نے اُن کو بڑے بڑے صندوقوں میں ہمیشہ کے لیے بند کردیا۔

رتّی کی قوم پرستی آج یہ قیاس کرنا دشوار ہے کہ رتّی زندہ رہتیں تو جناح کے سیاسی عقیدے پر اُن کا اثر کس طرح اور کس حد تک پڑتا۔ رتّی سخت قسم کی نیشنلسٹ تھیں۔ فرقہ واریت اُنھیں چھو تک نہیں گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتیں تو جناح اُنھیں اپنے گھر بلا لیتے اور دونوں کی زندگی انتہائی خوشگوار اور پُرلطف ہوتی۔ مجھ سے ہر روز رتّی پوچھا کرتی تھیں، مرکزی اسمبلی میں جناح کیسا کام کر رہے ہیں؟ کانگریسی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ جناح پر

فرقہ وارانہ رنگ چڑھ رہا ہے، کیا یہ درست ہے؟ چونکہ رتی ایک کٹر نیشنلسٹ تھیں، ایسی خبریں سُن کر اُن کا بے چین ہو جانا قدرتی بات تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگریسی پریس اور کانگریسی لیڈر بلا وجہ جناح کو بدنام کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ رتی گو عملی سیاست سے علاحدہ رہیں لیکن جناح کی زندگی میں بے حد معاون تھیں۔ جناح کو نیشنلسٹ رکھنے میں اُن کا بھی ہاتھ تھا۔

بد دماغی؟

کیا جناح بد دماغ تھے؟ اس سوال کا جواب میں نے ایک واقعہ کے حوالے سے "ٹائمز آف انڈیا" کی ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ کی اشاعت میں یوں دیا تھا:

"چونکہ جناح ریاست حیدرآباد میں سر مرزا اسماعیل کے وزیر اعظم بننے پر معترض ہوئے تھے اس لیے مؤخر الذکر نے ایک چھوٹی سی بات کو جناح اور نظام کے درمیان ہوئی، رائی کا پہاڑ بنا کر اپنی ذکی الحسی کا ثبوت دیا ہے۔ یقیناً جناح بجا طور پر بعض ایسے مسلم لیڈروں سے چڑے ہوتے تھے جو اپنے آپ کو "نیشنلسٹ مسلم" کہتے تھے اور جو کانگریس ہائی کمان کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر جناح کے خلاف سب وشتم سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ بعد کے واقعات جن کا اختتام ستمبر ۱۹۴۸ کے پولیس ایکشن پر ہوا اور جن کا ذکر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سکریٹری کیمبل جانسن کی کتاب[1] میں وضاحت کے ساتھ ہے، صاف ظاہر کرتے ہیں کہ نظام کا طریقۂ کار دانشمندی اور

---

[1] The End of a Mission

دُور اندیشی پر مبنی نہ تھا۔ جناح اگر نظام کے سامنے ٹانگیں پھیلائے سگار پیتے رہے تو اس سے نخوت کا اظہار مقصود نہیں تھا۔۔۔۔ یاد رہے کہ جناح درازقد اور اپنی لمبی پتلی ٹانگوں کی وجہ سے ہمیشہ پیروں کو آگے کرکے بیٹھا کرتے تھے۔ وہ مسلسل سگریٹ پینے کے عادی تھے۔"

اخلاق اور جرأت

میں یہاں ایسے دو واقعات کا ذکر کروں گا جن میں ایک سے جناح کی شائستگی اور دوسرے سے اُن کی جرأت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پہلا واقعہ یکم نومبر ۱۹۲۹ کو خود میرے گھر میں پیش آیا۔ مسز بیسنٹ میرے یہاں مہمان تھیں۔ اس کا ذکر میں نے جناح سے کیا؛ انھوں نے مسز بیسنٹ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ طے پایا کہ اگلے روز ہائی کورٹ جاتے ہوئے دس بجے دن کو وہ میرے یہاں آجائیں گے۔ حسب معمول وہ ٹھیک وقت پر آگئے جب میں انھیں مسز بیسنٹ کے کمرے کی طرف لے جارہا تھا تو میری نظر اُن کے سگریٹ پر پڑی ۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ مسز بیسنٹ تمباکو نوشی کو بہت ناپسند کرتی تھیں۔ یکایک مجھے اس کا دھیان آگیا اور میں نے زور سے کہا: "جناح، سگریٹ پھینک دو۔" وہ فوراً سمجھ گئے۔ سگریٹ پھینکتے ہوئے بولے: "معاف کرنا کانجی، مجھے یاد نہ رہا۔ تمھارا شکریہ!" پھر ہم مسز بیسنٹ کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اُنھوں نے ہماری گفتگو سُن لی تھی۔ جناح کی طرف دیکھ کر بولیں "کوئی بات نہیں ہے، تم شوق سے سگریٹ پی سکتے ہو۔" جناح نے کہا "نہیں نہیں مسز بیسنٹ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا ہے۔ اچھا ہوا کانجی نے مجھے ٹوک دیا۔ میں معذرت

چاہتا ہوں۔"

دوسرا واقعہ ۱۷ اگست ۱۹۴۰ء کو بمبئی کے گورمنٹ ہاؤس میں پیش آیا - ۸ اگست کی تجویزوں کے بعد جناح کو وائسرائے سے بمبئی میں ملنے کی دعوت دی گئی - اس سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے لارڈ لنلتھگو (وائسرائے) ایک "وار ایڈوائزری کونسل" تشکیل دے کر اس کا اعلان کر چکے تھے - اس کونسل میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں کا نام بھی شامل تھا، مسلم لیگ نے وار کونسل کا بائیکاٹ کرنا طے کیا تھا - اس کے باوجود سر سکندر حیات خاں (جو مسلم لیگ کے اہم رکن تھے) کونسل میں شریک ہو گئے - جناح کو یہ بات بہت ناگوار گزری - انھوں نے اخباروں میں یہ بیان دیا کہ لارڈ لنلتھگو کی یہ حرکت نہایت نامعقول ہے - اب ہوا یوں کہ وائسرائے سے ملاقات کا وقت گیارہ بجے دن کو مقرر تھا - لیکن اُس وقت تک جناح وہاں نہیں پہنچے - ہر شخص جناح کی طبیعت سے واقف تھا کہ وہ وقت کے کتنے پابند تھے ــــ ٹیلی فون پر ٹیلی فون ہوتے رہے - آخر سوا گیارہ بجے جناح گورمنٹ ہاؤس پہنچے - وائسرائے کو انتظار کی زحمت دینا خود جناح کے اخلاق سے بعید تھا لیکن اس موقع پر جناح نے کوئی معذرت نہیں کی - ہاتھ ملانے کے بعد جب دونوں بیٹھے تو وائسرائے نے اُن کے اخباری بیان کا ذکر کیا اور کہا کہ شاید جناح کو اُن کے (وائسرائے کے) طریقہ کار سے کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے جسے وہ دُور کر دینا چاہتے تھے - یہ سنتے ہی جناح اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: "جو کچھ ہوا اُس کے لیے مجھے وائسرائے سے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔" اتنا کہا اور وائسرائے کو

ہکا بکا چھوڑکر باہر نکل آئے - جو لوگ للیتھگو کے دبدبے سے واقف ہیں وہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے کے دل پر کیا گزری ہوگی - ہمیں اس واقعے پر فخر ہوتا ہے کیونکہ جب دوسرے ہندوستانی لیڈر (جن میں کانگریسی ہائی کمان کے لوگ بھی شامل تھے) اس برطانوی وائسرائے کے لیے "شریف ترین انگریز" اور "شریف ترین کرسچن" کی توصیفی صفتیں استعمال کر رہے تھے، کم از کم ایک ہندوستانی تو ایسا تھا جو حق گوئی اور بے باکی سے کام لے کر اُس کے منہ پر کھری کھری سُنا دینے کی جرأت رکھتا تھا۔

گاندھی جی کو بُلانے کا الزام

جناح کے اخلاق کے سلسلے میں ایک یہ بھی شکایت کی جاتی ہے کہ وہ اتنے مغرور تھے کہ خود گاندھی جی کی قیام گاہ پر جانے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوئے بلکہ اس پر اصرار کرتے رہے کہ گاندھی جی اُن کے یہاں آئیں - لیکن اس کا اصلی سبب خود جناح نے مجھے یہ بتایا تھا کہ جب کبھی وہ گاندھی جی کے یہاں ملنے گئے تو گاندھی جی کا کوئی نہ کوئی سکریٹری یا خادم ان دونوں کی بات چیت میں مُخل ہو جاتا - بعض اوقات اِس قسم کی مداخلت کا سبب نہایت مضحکہ خیز ہوتا —— آرٹیکل پر نظرثانی کرنی ہے! کچھ کاغذات کی تصحیح فوری طور پر ضروری ہے! اُن کی کوئی بہو ساس کی بدسلوکی کی شکایت لے کر آئی ہے —— غرض ان حالات میں کوئی سنجیدہ گفتگو ممکن ہی نہیں تھی - جناح نے گاندھی جی سے شکایت بھی کی کہ اگر اُن کے رفقا نہیں چاہتے کہ وہ اُن سے

صفائی کے ساتھ گفتگو کریں تو وہ (جناح) اُن کے یہاں آنا چھوڑ دیں گے۔ جناح کی اس صاف گوئی اور شکایت کو گاندھی جی نے بھی تسلیم کیا تھا۔

خوش پوش جنٹلمین

جناح بڑے ٹیپ ٹاپ کے آدمی تھے۔ انھیں صحیح طور پر "ہندوستان کے سیاسی لیڈروں میں سب سے زیادہ خوش پوش جنٹلمین" کہا گیا ہے۔ اُن کی اس خوش پوشی کی عادت میں اُن کی بیوی، رتی کو کتنا دخل تھا، یہ کہنا مشکل ہے۔ ۱۹۲۳ میں "ڈیلی ہیرالڈ" کے جنگی نمائندے کپتان وکٹر ہامن نے جناح کے بارے میں لکھا تھا: "مسٹر جناح اپنے گھر ہی کی طرح نفاست کا نمونہ ہیں ان کے چھریرے جسم پر بھورے رنگ کا سوٹ خوب جچتا ہے۔ اُن کی ٹائی اور پائتابوں سے شوخ رنگ کے باوجود معصومیت ٹپکتی ہے۔ عقابی چہرے پر لگی ہوئی یک چشمی عینک، عمیق نگاہوں اور بھورے سوٹ میں تو وہ بالکل جارج آرلس[1] کے چھوٹے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ برسوں کی وکالت کے تجربے نے اُن کی گفتگو میں بڑی صفائی پیدا کردی ہے۔"

گول میز کانفرنس کا اعلان

۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ اروِن نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو نوآبادیاتی درجہ دینے پر تیار ہے۔ یہ بھی اعلان ہوا کہ اس مقصد کی خاطر ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے گی جس میں دیسی ریاستوں، برطانوی حکومت

---

[1] ایک مشہور حسین فلم ایکٹر — م

اور ہندوستانی نمائندوں کو شریک کیا جائے گا۔ لارڈ اروِن کا یہ اعلان موتی لال نہرو کے مطالبے سے بہت قریب تھا اس لیے گرم جوشی سے اِس کا استقبال کیا گیا۔ گاندھی جی اور سپرو نے مل کر ایک بیان مرتب کیا جس پر اُن دونوں کے علاوہ جواہر لال نہرو، مدن موہن مالویہ، مسز بیسنٹ، ڈاکٹر انصاری، وِٹھل بھائی پٹیل اور چودھری خلیق الزماں کے بھی دستخط تھے۔ اِس بیان میں وائسرائے کے اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کانفرنس جلد از جلد بُلانے اور اعلان کے بعض حصّوں میں ترمیم کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔ در اصل جواہر لال کے دستخط کرانے میں گاندھی جی کا ہاتھ تھا۔ لیکن بعد کو جواہر لال نے اپنے دستخط واپس لے لیے۔ سوبھاش چندر بوس اور بائیں بازو کے' ان کے بعض ساتھیوں نے علاحدہ بیان دیا جس میں وائسرائے کی پیشکش کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ برطانوی لیبر پارٹی کی اس تجویز پر انگلستان میں کنزرویٹو اور لبرل پارٹی نے سخت نکتہ چینی کی، جس کی بدولت ایک طرح سے ہندوستانی انتہا پسندوں کو تقویت پہنچی۔ اُس نے کانگریس ورکنگ کمیٹی پر بھی اپنا اثر ڈالا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دلّی سے شائع کیے گئے بیان کو تعاون کا پروانہ ہرگز نہ سمجھا جائے۔ جناح اپنی جگہ ڈومینین حیثیت کی حکومت کے وعدے اور بقیہ تفصیلات گول میز کانفرنس کے ذریعے طے کیے جانے کی تجویز سے مطمئن تھے۔ جو اعتدال پسند تھے وہ دلّی کے بیان کی اِس شرط کو پسند نہیں کرتے تھے کہ مطالبے پورے نہ ہونے کی صورت میں عدم تعاون

کیا جائے۔ جناح اس بارے میں اعتدال پسندوں کے ہم خیال تھے۔ موتی لال نہرو بڑے فکرمند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ گول میز کانفرنس کی تجویز کو تباہ ہونے سے بچا لیا جائے۔ اُنھوں نے سپرو کو مشورہ دیا کہ کسی طرح گاندھی جی اور وائسرائے کے درمیان بات چیت کا انتظام کریں۔ سپرو نے یہ کام 'یو۔پی۔ کے گورنر بٹلر کے ذریعے انجام دیا۔ وٹھل بھائی پٹیل نے بھی سپرو کی مدد کی۔ پٹیل اُن دنوں سنٹرل اسمبلی کے صدر تھے اور وائسرائے سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ وائسرائے نے ملاقات کرنا منظور کرلیا لیکن اس شرط پر کہ موتی لال، سپرو، جناح اور وٹھل بھائی پٹیل کے ساتھ گاندھی جی سے بات چیت ہو۔ گفتگو تین چار نکات ہی پر ہونے والی تھی:۔ سیاسی قیدیوں کی رہائی، گول میز کانفرنس کے نمائندوں کا انتخاب۔ بعد میں یہ مسئلے برطانوی حکومت کی طرف سے بات چیت کے لیے منظور کرلیے گئے اور وائسرائے سے مُلاقات کی تاریخ ۱۳ دسمبر طے ہوگئی، لیکن موتی لال نہرو کو ۱۲ دسمبر کو لکھنؤ میں ایک اہم مقدمے میں حاضر ہونا تھا اس لیے انھوں نے ۱۳ کے بجائے ۱۴ دسمبر تجویز کیا مگر اُس دن وائسرائے بہاولپور شکار کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ آخر ۲۳ تاریخ مقرر ہوئی مگر اس تبدیلی نے ہندوستان کی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔

اتفاقات یا حادثات

وائسرائے کی کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے گاندھی جی وقت پر بمبئی پہنچ گئے تھے لیکن التوا کی خبر ملتے ہی وہ دس دن کے لیے وردھا چلے گئے۔ وہاں اُنھیں جواہر لال کے اُس خطبۂ صدارت کا مسودہ

ملا جو لاہور میں منعقد ہونے والے اجلاس میں پڑھا جانے والا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ گاندھی جی مسودے کی "تصحیح" کر دیں۔ اس خطبے میں جواہر لال نے واضح طور پر کانگریس کو مشورہ دیا تھا کہ گول میز کانفرنس کی دعوت مسترد کر دی جائے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گاندھی جی، جواہر لال کے خطبے سے ضرور متاثر ہوئے۔ اب اتفاق یہ ہوا کہ ۲۲ دسمبر کو جب وائسرائے میسور سے شکار کھیل کر واپس آ رہے تھے تو اُن کی گاڑی پر کسی نے بم پھینکا مگر خیریت ہوئی، کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ کانفرنس چار بجے سہ پہر کو شروع ہونے والی تھی۔ اُس دن صبح سے گاندھی جی کا ہفتہ وار چُپ کا روزہ شروع ہو گیا جو چار بجے ختم ہونے والا تھا۔ اِس روزے کی وجہ سے سپرو، جناح اور وٹھل بھائی پٹیل کو کوئی اندازہ نہیں ہو سکا کہ گاندھی جی کے خیالات میں کوئی تبدیلی بھی ہوئی ہوگی۔

کانفرنس میں کیا ہوا؟ کانفرنس رسمی تمہید سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد مطلب کی بات ہوئی۔ وائسرائے نے حاضرین سے پوچھا کہ اُن کے ذہن میں کوئی بات دریافت طلب ہو تو بتائیں مثلاً سیاسی قیدیوں کی رہائی، گول میز کانفرنس کی دعوت کا اصول وغیرہ۔ یہ بات طے تھی کہ گول میز کانفرنس میں کانگریس کے نمائندے سب سے زیادہ ہوں گے اور کانگریس ہی ان کا انتخاب کر کے وائسرائے کو نام بھیجے گی۔ قیدیوں کی رہائی بھی ایک طرح سے طے شدہ بات تھی۔ لیکن گاندھی جی نے اس موقع پر فرمایا کہ تفصیلات پر

بحث کرنے سے قبل وہ ہندوستان کے عام سیاسی حالات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ اس جائزے کا آغاز اُنھوں نے ۱۷۵۷ کی جنگ پلاسی کی داستان سے کیا اور یہ ثابت کرنے لگے کہ کس طرح برطانوی حکومت نے اپنا اعتبار کھودیا ہے اور فرمایا کہ وہ مجوزہ گول میز کانفرنس کے بارے میں اس وقت تک بحث کے لیے تیار نہیں ہوں گے جب تک لارڈ اروِن اِس کانفرنس میں ڈومینین حیثیت کا پکا وعدہ نہ کریں۔ گاندھی جی ایک گھنٹے تک بولتے رہے۔ اُن کی تقریر نہ صرف وائسرائے بلکہ سپرو، جناح اور وٹھل بھائی پٹیل پر بھی بم کے گولے کی طرح پڑی۔ موتی لال نہرو کو گاندھی جی نے پہلے سے اپنا ہمراز بنا لیا تھا۔ وائسرائے نے ہزار سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کانفرنس کا مقصد ڈومینین حکومت حاصل کرنے کے لیے میدان ہموار کرنا ہے اور وہ اس موقف میں ہرگز نہیں ہیں کہ فوراً برطانوی حکومت کی جانب سے ڈومینین حیثیت کی حکومت دے دینے کا اعلان کرسکیں۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا اور سمجھوتے کی یہ تمہیدی کانفرنس کچھ حاصل کیے بغیر ہی ختم ہوگئی۔ اس واقعے کے تین چار دن بعد سر تیج بہادر سپرو ایک کانفرنس کے سلسلے میں مدراس آئے۔ میں بھی تھیاسوفی کے ایک جلسے کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا۔ وہیں سی۔پی۔ راما سوامی آئر کے مکان پر سپرو نے یہ ساری داستان سُنائی۔ اس طرح پیہم اتفاقی حادثات کی وجہ سے ایک سنہرا موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ اگر گاندھی جی نے جواہر لال کا خطبہ نہ دیکھا ہوتا، اگر موتی لال کے مقدمے کی

تاریخ ۱۲ دسمبر نہ ہوتی، اگر وائسرائے نے شکار کو اہم ملکی معاملات پر ترجیح نہ دی ہوتی تو ہندوستان کی تاریخ آج کس قدر مختلف ہوتی! سن ۱۹۲۹ کے اخیر میں جواہر لال کے زیرِ صدارت کانگریس نے لاہور سیشن میں گاندھی جی کی پیش کی ہوئی "مکمل آزادی" کی تجویز منظور کرلی اور گول میز کانفرنس میں حصہ نہ لینے کا بھی فیصلہ کرلیا[1]

پہلی گول میز کانفرنس

سپرو اور جیکر کی ناکام کوششوں کے بعد ۱۱ ستمبر ۱۹۳۰ کو گول میز کانفرنس کے مندوبین کے ناموں کا اعلان ہوگیا۔ ۱۲ نومبر کو لندن میں اس کانفرنس کا افتتاح ہز مجسٹی شاہ جارج پنجم کی مصالحتی تقریر سے ہوا۔ کانگریس کے سوا ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں اور مختلف مفاد کے نمائندوں نے شرکت کی۔ دیسی ریاستوں کے بھی کئی نمائندے شریک ہوئے۔ بیکانیر کے مہاراجا گنگا سنگھ اور نواب صاحب بھوپال نے دیسی ریاستوں کی طرف سے سمجھوتے اور تعاون کی جو پیشکش کی اس سے سیاسی دنیا ششدر رہ گئی۔ بیکانیر کے مہاراجا پکے نیشنلسٹ تھے اور رجواڑوں میں بڑے ہی محقق آدمی مانے جاتے تھے۔ نواب صاحب بھوپال جناح کے گہرے دوست تھے اور سرکاری حلقوں میں "کانگریسی پرنس" کہلاتے تھے۔ ان کے سکریٹری برطانوی حکومت

---

[1] یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ دس سال کے بعد ۱۹۴۰ میں اسی شہر میں مسلم لیگ کی قیامِ آزاد مملکت پاکستان کی تجویز بھی منظور ہوئی تھی — م

کے بانی، شعیب قریشی تھے، جو سن ۱۹۲۲ میں گاندھی جی کے پیرو کی حیثیت سے قید بامشقت جھیل چکے تھے۔ دیسی ریاستوں کی طرف سے نواب صاحب بھوپال نے یہ اعلان کیا: "ہم لوگ ہندوستان سے وفاق کے لیے، اُسی صورت میں تیار ہوں گے جبکہ خود برٹش انڈیا کو خودمختار اور وفاقی بنا دیا جائے" اس طرح دیسی ریاستوں کا بنیادی مسئلہ تو طے ہو گیا لیکن ابھی ہندو مسلم مسئلہ باقی تھا؛ لیکن ڈاکٹر امبیڈکر نے پسماندہ قوم کے لیے جُداگانہ انتخاب کا مطالبہ پیش کر کے اس میں اور پیچیدگی پیدا کر دی۔

لندن میں کیا ہوا؟

اِن حوصلہ شکن حالات کے تحت لندن میں کیا ہوا، اس کی تفصیلات میں سر چمن لال سیتلواد کی کتاب[1] سے پیش کرتا ہوں:

"کانفرنس میں ہندوستان کی لبرل پارٹی کی خاصی نمائندگی تھی۔ سب ملا کر ۱۳ لبرل لیڈر تھے۔ گول میز کانفرنس شروع ہونے سے کافی دن پہلے ہم لندن پہنچ گئے تھے۔ طے پایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کچھ نمائندے آپس میں مل کر فرقہ وارانہ مسائل پر سمجھوتا کریں۔ سپرو، ساستری، جیکر، مونجے اور مجھے، آغا خان اور جناح سے ملنے کو کہا گیا۔ ہم نواب صاحب بھوپال کی قیام گاہ پر ملے اور کئی راتیں مسلسل ملتے رہے۔ نواب صاحب کی موجودگی سے بہت مدد ملی۔ وہ بڑے بے چین تھے کہ کسی طرح سمجھوتا ہو جائے۔ جب ہم پہلی بار ملے تو آغا خان سے میں نے پوچھا " اگر ہم کسی

---

[1] Recollection & Reflection

سمجھوتے پر پہنچ جائیں تو کیا آپ مخلوط انتخاب کا طریقہ منظور کرلینگے؟"
انھوں نے جواب دیا: "اگر تم دوسرے معاملوں میں ہمارے مطالبات تسلیم کرلو تو ہم مخصوص مسلم نشستوں کے لیے مخلوط انتخاب بھی منظور کریں گے۔" پھر میں نے دوسرا سوال کیا: "اگر ہم لوگ مخلوط انتخاب اور سارے مسائل پر سمجھوتا کرنے پر رضامند ہوجائیں تو کیا مسلم مندوبین کانفرنس میں قومی مطالبے کی تائید کریں گے؟"
انھوں نے بچے تلے انداز میں جواب دیا: "اس صورت میں تم رہنمائی کرو ہم تمھاری پیروی کریں گے۔" اس کے بعد ہم نے ان سے پوچھا کہ سمجھوتے کے لیے اُن کے مطالبات کیا کیا ہیں؟ انھوں نے یہ خاص مطالبے بتائے: سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے علاحدہ علاحدہ دو صوبے بنائے جائیں اور صوبائی اسمبلیوں کی نمائندگی میں مسلمانوں کو معقول نمائندگی حاصل ہو؛ مرکزی اسمبلی کی جملہ نشستوں کی ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کے لیے مخصوص ہوں۔ اس وقت تک جو دیسی ریاستیں اپنے نمائندے مرکزی اسمبلی میں بھیجنے والی تھیں، ان کے وفاق کا سوال نہیں اُٹھا تھا۔ سپرو، ساستری اور ہم ان مطالبات کو اسی وقت تسلیم کرکے مخلوط انتخابات کا اُصول بھی منوالیتے لیکن ہمیں جیکر اور مونجے کے رویے سے بے حد مایوسی ہوئی۔ پہلے ہم نے سندھ کے علاحدہ صوبہ بنانے کا سوال کیا۔ جیکر اور مونجے اِس سلسلے میں بہت سی شرطیں لے آئے جن کا پورا ہونا، ان کے خیال میں ضروری تھا۔ صرف اسی ایک مسئلے پر بحث کرنے میں کئی شامیں گزر گئیں؛

دوسرے نکات پر بحث میں بھی کئی راتیں صرف ہوئیں - اِس دوران میں ہندوستان کے بعض رجعت پسند مُسلمانوں کو جو لندن میں مقیم تھے، ہماری کارروائیوں کی بھنک لگ گئی - اُنھوں نے مسلمان مندوبین پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا - آخر ایک رات کو آغاخان نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب معاملہ اُن کے قابو سے باہر ہے اور وہ مسلمان مندوبین کو کسی سمجھوتے کا پابند نہیں کرسکیں گے - اس طرح ایک اور سُنہرا موقع ہاتھ سے جاتا رہا! اگر میرا، سپرُو یا ساستری کا بس چلتا تو ہم آغاخان کے مطالبات منظور کرکے، مخلوط انتخابات کا اُصول تسلیم کراکے، مُسلم مندوبین سے دستخط حاصل کرلیتے، اور جو یہ ہوتا تو ہندوستان کی تاریخ آج کچھ اور ہی ہوتی"

جناح کا رویّہ

کانفرنس کے دوران میں جناح نے دونوں جانب کے رجعت پسندوں کے خلاف اپنا رویّہ کھُلم کھُلا ایک پکّے نیشنلسٹ کا رکھا - اُنھوں نے برطانوی کنزرویٹو پارٹی پر یہ کہہ کر بڑا سخت حملہ کیا کہ ہندوستان میں اُن کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اُن کے تجارتی مفاد محفوظ رہیں - اس بیان سے کنزرویٹو پارٹی کے ارکان بہت برہم ہوئے - اُنھوں نے آغاخان کے ذریعے جناح پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے مقام سے ذرا بھی نہیں ہٹے اور ہندوستانیوں کے مقاصد اور ان کے مفاد کے لیے ڈٹے رہے - برطانیہ کے وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ نے جناح کو بلاکر سمجھایا کہ حالات جس طرح چلنے والے ہیں اُن کے پیشِ نظر

برطانوی وزیرِاعظم کو ایسے ہندوستانیوں کی ضرورت ہوگی جو صوبوں کے گورنر بن سکیں گے۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اگر جناح نے "نیک بختی" کا ثبوت دیا تو انھیں بھی گورنری کے عہدے سے سرفراز کیا جا سکتا تھا۔ جناح نے جواب میں ریمزے میکڈونلڈ سے پوچھا کیا برطانوی تجارتی مفاد کو محفوظ کرانے کی خاطر انھیں رشوت دی جا رہی ہے؟

رشوت کے بعد دباؤ

آغا خان نے جناح پر پورا دباؤ ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔[۱] ایک روز جب رات کے بارہ بج رہے تھے آغا خان نے جناح کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر وہ (جناح) برطانوی تجارتی مفاد کی مخالفت کرتے رہیں گے اور سپرو، شاستری اور سیتلواد کے ساتھ مل کر ہندو مسلم سمجھوتے پر رضامند ہو جائیں گے تو یہ بات یقینی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کی مدد کبھی حاصل نہ ہوگی۔

سر فضلِ حسین کا کارنامہ

اُن دنوں ہندوستان میں سر فضلِ حسین وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل کے ممبر تھے۔ انھیں جب لندن میں ہندو مسلم سمجھوتے کی کوششوں کا علم ہوا تو بڑے سٹ پٹائے۔ اپنی ڈائری میں ۲ دسمبر ۱۹۳۰ کو لکھتے ہیں:

"گول میز کانفرنس کی خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ (برطانوی) لیبر گورنمنٹ نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ مسلمان کسی

---

[۱] محمد علی جناح پیدائشی اسماعیلی خوجہ تھے جن کے آغا خان امام ہیں۔ اور ایک اسماعیلی کے لیے آغا خاں کا حکم ماننا مذہبی فریضہ ہو جاتا ہے۔ — م

عنوان سے مخلوط انتخابات کا اصول تسلیم کرلیں۔ شفیع، بھوپال، سلطان احمد، فضل حق، ہدایت اللہ اس چال میں آگئے ہیں۔ لیکن دوسرے اس کے مخالف ہیں۔ محمد علی بھی مدد کرنے کی کوشش میں اور جناب جناح پس پردہ اس کی حمایت میں لگے ہوئے ہیں۔ مجھے سخت اقدام کرنے پڑے تب جاکر معاملہ بال بال بچ سکا۔ ہم لوگوں کو بہرحال جداگانہ انتخابات کے ذریعے ہی بنگال اور پنجاب کے اکثریت کے صوبوں میں اور باقی چھ صوبوں اور مرکزی اسمبلی میں اپنا وزن قائم رکھنا چاہیے۔ ہندو چاہیں تو تعاون نہ کریں۔ اس کے بعد اگلے دس برس میں ہم کو اپنی طاقت کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

دوسری گول میز کانفرنس

۱۹ جنوری کو پہلی گول میز کانفرنس ملتوی کردی گئی اور مندوبین ہندوستان واپس چلے آئے۔ ۲۵ جنوری کو چوٹی کے قومی رہنما قید سے رہا کردیے گئے۔ ۹ فروری کو موتی لال کا انتقال ہوگیا۔ گاندھی جی نے سپرو اور سیتلواد کی زبانی گول میز کانفرنس کی روداد سنی۔ اس کے بعد انھوں نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ گاندھی جی اور لارڈ اروِن کی آٹھ بار ملاقاتیں ہوئیں جس کے بعد ۴ مارچ کو "گاندھی اروِن پیکٹ" تیار ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے سول نافرمانی کی تحریک روک دی گئی۔ سارے سیاسی قیدی چھوڑدیے گئے؛ انسدادی قانون اور اجتماعی جرمانے واپس لے لیے گئے۔ کانگریس نے دوسری گول میز کانفرنس میں حصہ لینے کا بھی فیصلہ کیا۔ اس بار کانفرنس کے مندوبین میں گاندھی جی، سپرو،

ساستری، سیتلواد، جیکر، امبیڈکر اور آغاخان بھی تھے۔ جناح لندن ہی میں تھے لیکن وہ بحث میں کوئی اہم حصّہ نہ لے سکے کیونکہ وہ کانگریس کو کسی معقول سمجھوتے پر رضامند کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ مسلمانوں کی قیادت آغاخان کے جیسے رجعت پسندوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اِس کانفرنس کے سب سے اہم ڈیلی گیٹ گاندھی جی تھے جو تنہا کانگریس کی نمائندگی کر رہے تھے۔

گاندھی جی کی غلطی

سیتلواد نے اپنی کتاب[1] میں اور شاستری نے دوسری گول میز کانفرنس کے متعلق اپنے خطوط میں جو کچھ لکھا ہے، انھیں پڑھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ وفاق (فیڈریشن) اور اقلیتوں — بالخصوص مسلمانوں اور اچھوتوں کے متعلق —— گاندھی جی نے کتنی بڑی سیاسی غلطی کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر گاندھی جی، پنڈت مالویہ، جیکر اور جی۔ ڈی۔ برلا جیسے فرقہ پرست ہندوؤں کے اثر میں نہ آئے ہوتے تو فرقہ وارانہ مسئلہ اور پست قوم کا مسئلہ اِس کانفرنس میں طے ہو جاتے۔

مخلوط انتخابات کب اور کیسے؟

اقلیت کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے سیتلواد نے یہ ایک اہم دُور اندیشانہ نوٹ لکھا ہے:

"جہاں تک جُداگانہ اور مخلوط انتخابات کے جھگڑے کا تعلق ہے یہ بات ظاہر ہے کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں اُن میں اُن کا مفاد اور تحفظ مخلوط انتخابات کے ذریعے ہو سکتا ہے۔

---

[1] مذکور

اگر ایک بار مذہبی معاملات، تہذیب، پرسنل لا، معاشرتی روایات، تعلیم، ملازمتوں میں معقول حصّہ اور اسمبلی میں اُن کی معقول نمائندگی کا تحفظ ہو جائے اور اس طرح مفاد کے ٹکراؤ اور مختلف فرقوں کے درمیان اختلاف کا انسداد کر دیا جائے تو پھر یقیناً اقلیتی فرقوں کے لیے مناسب یہی ہوگا کہ وہ مخلوط انتخابات کو تسلیم کرلیں۔ جب تک اکثریت فرقے کے نمائندوں کے انتخاب کرنے میں مسلم ووٹروں کی موثر آواز نہ ہوگی اس وقت تک وہ اکثریت پر اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ یہ اُصول بعض مشہور مُسلم لیڈر مثلاً ہز ہائنس آغاخاں، مسٹر جناح اور کئی دوسرے بھی مان چکے ہیں۔ اور جو اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے اگر نشستیں بھی محفوظ کر دی جائیں تو پھر ان کا تحفظ پوری طرح ہو جاتا ہے۔"

جناح کی مقبولیت

سیتلواد آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اس وقت جناح اس خیال سے مکمل اتفاق رکھتے تھے۔ عرصے تک وہ یہ محسوس کرتے رہے کہ اگر اُن کے لیے آئینی طور پر یہ ممکن ہو جائے تو اسمبلی کے لیے وہ عام نشست سے الیکشن لڑیں گے۔ اُن دنوں واقعی اگر جنرل سیٹ سے کھڑے ہو جاتے تو مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ بڑی اکثریت سے کامیاب ہو جاتے۔"

سیتلواد کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ میں بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سن بیس اور تیس کے درمیان جناح کسی بھی سیاسی پارٹی یا کسی بھی فرقے کے حریف کے مقابلے میں بھاری اکثریت سے جیت جاتے۔

بمبئی کے وہ اہم ترین اور مقبول ترین لیڈر تھے۔

تیسری گول میز کانفرنس

۲۷ جون ۱۹۳۲ کو برطانوی پارلیمنٹ میں سر سیموئیل ہور، سکریٹری آف اسٹیٹ نے حکومت کی طرف سے تیسری گول میز کا اعلان کیا۔ اس مرتبہ طریقۂ کار اب تک کی برطانوی پالیسی سے جُدا تھا۔ ۱۶ جولائی کو بمبئی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کے اختتام پر سپرُو، شاستری، جیکر، چنتامنی اور رنگا سوامی آئنگر کے دستخطوں سے ایک بڑا سخت بیان شائع ہوا جس میں برطانوی حکومت کی نئی پالیسی کی مذمت کی گئی تھی۔ بہرحال ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ کو لندن میں تیسری گول میز کانفرنس ہوئی۔ اس میں برطانوی لیبر پارٹی کے نمائندے شریک نہیں ہوئے۔ برٹش انڈیا کے نمائندوں کی تعداد بھی پہلی اور دوسری کانفرنس کے مقابلے میں کم تھی۔ ساستری، سیتلواد، جناح اور چنتامنی کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔

جناح لندن میں

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد یعنی دسمبر ۱۹۳۱ ہی سے جناح لندن میں مقیم ہو گئے تھے۔ میں وہاں کئی بار اُن سے ملا، ہیمپ اسٹیڈ میں ایک مکان خریدنے کے بعد وہ مستقل طور پر لندن میں پریکٹس کر رہے تھے۔ کنگز بنچ واک میں اُن کا چیمبر تھا۔ چونکہ انھوں نے اپنے آپ کو ہندوستانی سیاست سے ایک حد تک بے تعلق کر لیا تھا اس لیے برطانوی حکومت نے انھیں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہیں دی اور نہ انھیں مئی ۱۹۳۲ میں جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے کاموں میں شریک کیا۔

علاحدگی کا سبب

پانچ سال بعد سن ۱۹۳۸ میں تقریر کرتے ہوئے خود عائد کردہ جلاوطنی کا سبب جناح نے ان الفاظ میں بیان کیا:

گول میز کانفرنس کے موقع پر مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھکا لگا۔ خطرے کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی مجھے ہندو جذبات، ہندو ذہنیت اور ہندو مزاج نے اس نتیجے پر پہنچادیا کہ اب اتحاد کی کوئی امید باقی نہیں ہے۔ میں اپنے ملک کی طرف سے مایوس ہوگیا۔ صورتِ حال بے حد افسوسناک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مسلمان بے وطن ہیں، انھیں یا تو برطانوی حکومت کے حکام ہنکاتے پھرتے تھے یا پھر کانگریس کے پٹھو ہی کام کرتے تھے۔ جب بھی مسلمانوں کی تنظیم کی کوشش کی گئی، ایک طرف ٹوڈی اور دوسری طرف کانگریسی حلقے کے بعض غدار، ان کوششوں کو ناکام کردیتے تھے۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ نہ میں ہندوستان کی مدد کرپاتا ہوں نہ ہندو ذہنیت کو بدلنے کی سکت رکھتا ہوں اور نہ ہی مسلمانوں کو صورتِ حال کی نزاکت سمجھانے میں کامیاب ہوسکتا ہوں۔ میں اس حد تک پژمردہ اور مایوس ہوگیا کہ لندن ہی میں سکونت اختیار کرلینے کا تہیہ کرلیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ہندوستان سے مجھے محبت نہیں تھی —— میں اپنے آپ کو مجبورِ محض پاتا تھا۔"

میں جب جناح سے لندن میں ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہندوستان سے اٹھارہ مہینوں کی غیر حاضری کے دوران میں وہ ملک کے

حالات سے بڑی حد تک بیخبر ہو چکے تھے۔ لندن میں جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی کارروائیوں تک سے ناواقف تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اس زمانے میں نہ تو وہ کسی ہندوستانی لیڈر سے ملنے گئے اور نہ کوئی ان سے ملنے آیا۔ اُن کو اس کا علم نہیں تھا کہ مجوزہ دستور کی ہیئت کیا ہونے والی تھی۔ لیکن اس بیخبری کے باوجود انھیں یہ جاننے کا شوق تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ مجھ سے بے شمار گہرے گہرے سوالات کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس شخص کے دل سے نہ تو ہندوستان سے دلچسپی گئی ہے اور نہ اس کی محبت کم ہوئی ہے۔

جناح نے چائے بنائی ایک روز جناح کے ساتھ لنچ کھانے کے بعد سہ پہر میں پھر اُن کے چیمبر میں ملنے گیا۔ وہاں اُس عظیم لیڈر، بانیٔ پاکستان نے، کیتلی میں میرے لیے اپنے ہاتھ سے پانی گرم کیا اور چائے بنائی۔ اُس دن میں اُن کے ساتھ تقریباً پانچ گھنٹے رہا۔

واپسی کیسے ہوئی؟ لندن میں بس جانے کے بعد بھی ایک نہ ایک دن ہندوستان واپس آنے کی تمنا جناح کے دل میں ہمیشہ مچلتی رہی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے لیے اُن کے ذہن میں کوئی خاص نقشہ یا پلان نہ تھا۔ انھوں نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ اُن کا ہندوستان واپس آنا اُس وقت تک بے سود ہے جب تک اُن کی کھوئی ہوئی پوزیشن دوبارہ نہ مل جائے اور اُنھیں سیاسی لیڈر شپ حاصل نہ ہو جائے۔ یہ موقع لیاقت علی خاں نے بہم پہنچایا۔

لیاقت علی خاں، جو جناح کے گورنر جنرل بننے پر پاکستان کے پہلے

وزیراعظم بنے، اُن کے بڑے دوست اور رفیقِ کار رہے تھے۔
میرے یورپ پہنچنے کے کچھ دنوں ہی بعد وہ جناح سے ملے۔
سب سے پہلے لیاقت علی خاں کی جناح سے ملاقات کلکتہ میں
آل انڈیا پارٹیز کانفرنس کے بعد ۱۹۲۸ کے مسلم لیگ کے اجلاس
میں ہوئی تھی۔ اس موقع پر لیاقت علی خاں نے جناح کے نقطۂ نظر
کی تائید کی تھی۔ اس وقت سے وہ جناح کے دوست اور شریک کار
بن گئے تھے۔ لندن کی ملاقات میں لیاقت علی نے جناح کو سمجھایا
کہ اب اُن کے ہندوستان کو مراجعت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔
لیاقت علی نے انھیں بتایا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ایسے
لیڈر کی ضرورت ہے جسے کسی قیمت پر خریدا نہ جا سکے۔ لیاقت علی
اور مسز لیاقت علی، دونوں نے جناح کی بڑی منت سماجت کی کہ
وہ مسلم لیگ کی قیادت قبول کر لیں۔ جناح راضی ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۳۳
میں مجھے جناح کا یہ خط ملا:

"ڈیئر کانجی۔

تمھارے خط مورخہ ۲۷ نومبر کا شکریہ۔

میں ۲۲ دسمبر ۱۹۳۳ کو مارسیلز سے "کلوجا" نامی جہاز سے روانہ ہو رہا ہوں اور امید کہ ۴ جنوری ۱۹۳۴ کو بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد تم سے اور دوسرے احباب سے مدت کے بعد دوبارہ ملنے کا اشتیاق رہے گا۔

محبت کے ساتھ تمھارا مخلص

ایم۔ اے۔ جناح"

ناکامی کی ذمہ داری

لندن کے دوران قیام میں میری ملاقاتیں سر ارنسٹ ہوٹسن سے ہوتی رہیں۔ یہ میرے بمبئی کے دوست تھے۔ ۱۹۲۰ کے لگ بھگ وہ بمبئی میں ہوم ممبر تھے اور کچھ دنوں کے لیے گورنر بھی رہ چکے تھے۔ میں نے لندن میں اُن سے پوچھا "آپ کے خیال میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسئلے کا حل کیا ہے؟" اُنھوں نے جواب دیا: "اگلی نسلیں" پھر اپنے جواب کی خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولے: "ہندوستان کی نئی نسل، ہندو اور مسلم، لڑکیاں اور لڑکے اب ایک ساتھ تعلیم پا رہے ہیں۔ ان میں نہ فرقہ وارانہ اختلافات ہیں نہ ذات پات کے بھید بھاؤ۔ آگے بڑھ کر جب یہ سِن شعور پر پہنچیں گے تو تعجب کریں گے کہ ان کے باپ دادا کیسے بے وقوف تھے کہ انھوں نے ذات پات اور دھرم کے جھگڑوں میں پھنس کر، اپنے ملک کو سوراج سے دور ہٹا کر، برطانیہ کو پھوٹ ڈالنے اور حکومت کرنے کا موقع دے رکھا تھا۔ ایک نسل کے بعد فرقہ وارانہ مسئلہ ختم ہوجائیگا۔" اس بات کو تیس سال گزر چکے ہیں؛ ایک چھوڑ دو دو نسلیں سامنے آچکیں مگر فرقہ وارانہ مسائل بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور ابھی تک اُن کا کوئی حل نظر نہیں آتا ہے۔ سن ۱۹۳۳ میں ایسا ضرور لگتا تھا کہ ہوٹسن کے اندازہ کے مطابق یہ مسئلہ ایک نسل کے بعد ہی طے ہوجائے گا۔ میں اور جناح، دونوں اس پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن میرا، ہوٹسن اور جناح کا یہ خواب اگر شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا تو اس کی ذمہ داری مسلم لیگ سے کہیں زیادہ کانگریس پر عائد ہوتی ہے۔

جناح کی علالت

مارچ ۱۹۳۴ کی ایک شام جناح نے مجھے فون کیا کہ اگلے دن ساڑھے دس بجے میں ان کے ہائی کورٹ چیمبر میں ملوں۔ چنانچہ میں وہاں وقت پر پہنچ گیا مگر جناح کا پتہ نہ تھا۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی کیونکہ ہمیشہ وہ ٹھیک ساڑھے دس بجے ہائی کورٹ پہنچ جایا کرتے تھے۔ ان کے بنگلے پر فون کیا تو ملازم نے بتایا کہ وہ گذشتہ رات کو بہت بیمار ہو گئے تھے۔ پانچ دن جناح پر غشی رہی اور وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ جس روز انھیں ہوش آیا میں ان کے گھر پہنچا۔ انھوں نے پاس بلایا۔ تیمارداروں کی ناگواری کے باوجود نصف گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ

جولائی ۱۹۳۵ میں برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا۔ یہ دستور جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا نتیجہ تھا جو لارڈ لنلتھگو کی صدارت میں مقرر کی گئی تھی۔ سر سیموئل ہور نے اس کمیٹی کے سامنے جو شہادت دی تھی اس کے سلسلے میں وہ اپنی کتاب[1] میں لکھتے ہیں:

"پارلیمنٹ کے بتیس ممبر اور ستائیس ہندوستانی اسیسروں نے مجھ پر جو جرح کی اس کا سلسلہ اُنیس دن تک جاری رہا۔ میں نے اس دوران میں کوئی دس ہزار اصلی اور ضمنی سوالوں کے جواب دیے۔ گو ان سوالات کے دائرے میں صوبائی

---

[1] Nine Troubled Years

خود مختاری اور کُل ہند وفاق کے متعلق ہر طرح کے سوالات
پوچھے گئے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی برطانوی یا
ہندوستانی نے ہندوستان کی تقسیم کے امکان کی طرف
کوئی اشارہ بھی نہیں کیا۔ اُس وقت تک پاکستان کی حیثیت ایک
مُسلم شاعر کے رومانی دماغ کے تصور سے زیادہ نہ تھی۔ لفظِ
"پاکستان" بھی تقریباً غیر معروف تھا"
گورنمنٹ آف انڈیا بِل جب پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اس پر بحث
کے دوران میں پندرہ ملین الفاظ بولے گئے جو کوائف پارلیمنٹ
کے چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں لیکن اس میں کہیں بھی "پاکستان"
کے اِمکانی وجود کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ردِ عمل

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ رجعت پسند اقدام تھا۔ اس کا
مقصد برطانوی تجارتی مفاد کو مستحکم کرنا اور اِس مقصد کو حاصل
کرنے میں مدد کے لیے کڑی دفعات کی پناہ موجود تھی۔ کسی
ہندوستانی اسمبلی کو ایسے قانون پاس کرنے کی اجازت نہیں
دی گئی تھی جس سے ہندوستان میں کام کرنے والی برطانوی
تجارتی فرم اور جہازراں کمپنیوں کے ساتھ امتیازی سلوک برتے
جانے کا امکان ہو۔

اپریل ۱۹۳۶ میں جناح نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت
سے بمبئی کے جلسوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر تنقید کرتے
ہوئے کہا کہ اس ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کو ذمہ داری تو صرف
دو فی صدی دی گئی ہے لیکن گورنر جنرل کے اختیاراتِ خصوصی اور

تحفظات کا حصّہ ۹۸ فی صدی رکھا گیا ہے۔ پھر وہ دو فی صدی ذمّہ داری بھی دو وفاقی اسمبلیوں کے درمیان پھنس کر گُم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد دستور کو بدلنے کی غرض سے برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے طریقے پر بولتے ہوئے جناح نے کہا کہ ملک میں فوجی انقلاب ناممکن سی بات ہے۔ نان کوآپریشن کا طریقہ آزمایا گیا اور ناکام رہا۔ اب صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ آئینی احتجاج جاری رکھ کر اسمبلیوں کے اندر اور ایوان سے باہر ایسی قوتوں کو اُبھارا جائے جس سے گورنمنٹ جھکنے پر مجبور ہو جائے۔ لیکن یہ اُسی حالت میں ممکن ہوگا جبکہ سب فرقے مل کر شانہ بشانہ کام کریں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ کانگریس اپنے مقصد میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ نہ لے۔ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے جناح نے کہا کانگریس اُن کے حقوق نہ بھی تسلیم کرے تب بھی اپنی قوم اور اپنے ملک کے مفاد کی خاطر اُنھیں اپنے آپ کو منظم کرنا چاہیے اور حصولِ آزادی کی راہ پر گامزن ہو کر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ اس طریقۂ کار میں کامیاب ہو گئے تو کانگریس خود اُن کے پاس آنے پر مجبور ہوگی۔

لنلتھگو کی کوششیں لارڈ ولنگڈن کے بعد لارڈ لنلتھگو ہندوستان کے نئے وائسرائے مقرر ہوئے۔ اُن کی حکومت اور خود وہ، اگر چاہتے تو دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کا تعاون حاصل کر کے فیڈریشن (وفاق) کا اُصول منوا لیتے لیکن وہ ہر راجا اور نواب سے فرداً فرداً

فیڈریشن کا اصول قبول کروانے لگے۔ دو سال گزر گئے، نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اس تضیعِ اوقات کی ذمّہ داری کانگریس پر بھی کچھ کم عائد نہیں ہوتی ہے۔ اگر جناح کا مشورہ قبول کرکے کانگریس اسمبلیوں کے اندر اور باہر آئینی جدوجہد رکھتی اور اگر کانگریس، جناح اور مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرکے فیڈریشن کے مطالبے پر برابر زور دیتی تو صورتِ حال بالکل دوسری ہوتی، خصوصاً اس حالت میں جبکہ ہر پارٹی "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی مذمت پہلے ہی کر چکی تھی۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات

ملک میں سن ۱۹۳۷ کے اوائل میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ کانگریس نے اس سلسلے میں جو منشور شائع کیا اس میں دو باتیں متضاد تھیں۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا تھا کہ کانگریس کے ممبر اسمبلیوں میں جاکر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر عمل کرنے کے بجائے اس کو ختم کرنے کے لیے لڑتے رہیں گے۔ دوسری طرف اسی منشور میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کانگریسی ارکان اسمبلی میں کون کون سے تعمیری کام کریں گے۔ کانگریس کو یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ صوبائی انتخابات میں اُسے قطعی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ البتہ یہ اُمید تھی کہ انتخابات کے بعد وہ سب سے بڑی واحد پارٹی ہوگی اور کسی دوسری کم تعداد کی پارٹی کے ساتھ مل کر اکثریت کی پارٹی بن سکے گی۔ اس امکان کے پیشِ نظر انتخابات سے قبل، کانگریس نے مسلم لیگ سے مفاہمت کرلی تھی۔ کوئی تحریری معاہدہ تو نہیں ہوا لیکن یو۔پی۔ میں جواہر لال نہرو

اور چودھری خلیق الزماں کے درمیان یہ بات طے پاچکی تھی کہ بدیسی حکومت کی مخالفت میں دونوں مل کر کام کریں گے، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان یہ کوئی نئے قسم کا سمجھوتا نہیں تھا۔ اس سے پہلے سن بیس میں موتی لال نہرو اور جناح کے درمیان اور اس کے بعد سن چالیس میں بھولا بھائی ڈیسائی اور لیاقت علی خاں کے درمیان، اسمبلیوں میں اتحادِ عمل کا پیمان ہوچکا تھا۔ انتخابات کے نتیجے نکلے تو پانچ صوبوں میں کانگریس کو قطعی اکثریت حاصل ہوگئی۔ چار صوبوں، یعنی بمبئی، بنگال، آسام اور صوبہ سرحد میں کانگریس ہی سب سے بڑی واحد پارٹی ثابت ہوئی۔ بمبئی میں کانگریس کے ممبروں کی تعداد بقیہ دوسرے ممبروں کے مقابلے میں ایک کم تھی۔ پنجاب اور سندھ میں کانگریس اقلیت میں رہی۔ مسلم لیگ نے بھی خاصی کامیابی حاصل کی۔

وزارت کی دعوت

مارچ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ دلی میں ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ کانگریس اس شرط پر وزارتیں قبول کرے گی کہ صوبائی گورنر یقین دلائیں کہ وہ اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام نہیں لیں گے۔ بمبئی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر بی۔ جی کھیر چنے گئے۔ لارڈ برے بورن نے، جو گورنر تھے، کھیر کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ لیکن چونکہ گورنر، کانگریس کی شرط ماننے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے انھوں نے انکار کر دیا۔ اس پر لارڈ برے بورن نے دوسری پارٹی یعنی مسلم لیگ کے لیڈر سر علی محمد خاں دہلوی کو وزارت بنانے کو کہا مگر جیسا کہ خود جناح نے مجھے بتایا، ان کی ہدایت کے

ماتحت علی محمد دہلوی نے یہ کہہ کر معذرت پیش کردی کہ جمہوری نظامِ حکومت میں اقلیت وزارت قائم کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ لیکن جیسے ہی علی محمد دہلوی اپنے گھر پہنچے، برببورن نے انھیں دوبارہ فون کیا کہ وہ سیاسی پارٹی کے رکن کی حیثیت سے نہ سہی اپنی انفرادی حیثیت میں عبوری حکومت میں شریک ہوجائیں۔ جناح کو اس کا علم ہوا تو لارڈ برببورن کی اس غیر آئینی حرکت پر بہت برہم ہوئے اور اُنھیں سخت احتجاجی خط لکھا جس میں سیاسی جماعتوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ بہرحال برببورن نے ایک عبوری حکومت بنا ڈالی جو صرف تین مہینے قائم رہی۔ اس درمیان میں تعطل دُور کرنے کی غرض سے کانگریس سے گفت و شنید کا سلسلہ پسِ پردہ جاری رہا۔ وائسرائے نے یقین دلایا کہ ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ گورنمنٹ اور وزارتوں میں ہم آہنگی قائم رہے اور ایسی صورت پیدا نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے وزارتوں کا وجود ہی خطرے میں پڑجائے۔ اس طرح کانگریس کے مطالبے منظور نہ ہونے کے باوجود صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کا اعلان ۷ جولائی ۱۹۳۷ کو کردیا گیا۔

کھیر اور مسلم وزیر

بمبئی میں کھیر وزیرِ اعلیٰ چُنے گئے۔ انھوں نے جناح سے اپنی وزارت میں شامل کرنے کے لیے دو مسلم لیگ ممبروں کے نام مانگے۔ جناح اس کے لیے بہ خوشی رضامند ہوگئے اور کانگریسی وزارت کو مسلم لیگ کے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا اس کی داستان خود بی۔ جی۔ کھیر نے مجھے سنائی اور جس کی تصدیق بعد میں

جناح نے کی۔ قصہ یہ ہوا کہ کانگریس ہائی کمان اس کے لیے کسی طرح رضامند نہ تھا کہ جناح سے کسی قسم کا تعلق پیدا کیا جائے۔ چنانچہ کھیر کی یہ خواہش رَد کر دی گئی اور اس کی بدلی ہوئی شکل یُوں پیش کی گئی کہ مسلم لیگ کے جن دو ممبروں کو لیا جائے گا وہ پہلے لیگ سے مستعفی ہوں اور کانگریس میں شریک ہو جائیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ شرط لیگ کے لیے انتہائی ہتک آمیز تھی۔ جناح بجا طور پر اس سے خفا ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے کانگریس کی تجویز ٹھکرا دی۔ وہ کانگریسی وزارت سے تعاون ضرور کرنا چاہتے تھے لیکن اپنی پارٹی کا گلا نہیں گھونٹنا چاہتے تھے۔

نہرو کی غلطی

بمبئی ہی کی جیسی غلطی یو۔پی۔ میں نہرو نے کی۔ کانگریس کی غیر متوقع کامیابی سے وہ پھُولے نہیں سمائے اور اِسی ترنگ میں خلیق الزماں سے کیا ہوا وہ وعدہ بھُلا بیٹھے جس کے تحت اُنھوں نے کانگریسی وزارت میں مسلم لیگ کے دو ممبر لینا منظور کیا تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایلکشن میں کانگریس کے رفیع احمد قدوائی کی کامیابی خلیق الزماں کی مدد کی رہینِ منت تھی۔

"یومِ نجات"

اِن واقعات نے جناح کو بے حد ناراض اور خفا کر دیا اور وہ اِس نتیجے پر پہنچنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ کانگریس اُن کا تعاون صرف اُن کی توہین کر کے ہی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ سن ۱۹۳۹ میں کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے دستور کی دفعہ ۹۳ کے تحت صوبوں کا سارا نظم و نسق گورنروں کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ صورتِ حال جناح کے حق میں مفید

ثابت ہوئی - کانگریس کے اس فیصلۂ "خودکشی" پر انھوں نے ۲۲ دسمبر کو "یومِ نجات" منانے کا اعلان کیا - اب جنگ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان چھڑ گئی - مگر اس زمانے میں بھی ان دونوں کے اختلافات کی خلیج کو کم کرنے کی کوشش ہوتی رہی - میرا خیال ہے کہ اگر کانگریس وزارتیں نہ چھوڑتی اور جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ مصالحت کی کوشش کرتی تو فرقہ وارانہ امن قائم رکھنے میں کامیابی ہوسکتی تھی اور اس طرح برطانوی حکومت کو ڈومینین حیثیت کی حکومت کا مطالبہ پورا کرنے پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔

ہندوؤں پر عدمِ اعتماد

میں ۱۹ دسمبر ۱۹۳۸ کو جناح سے ملا۔ سیاسی حالات کے بارے میں ان کا اندازِ فکر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے گفتگو کا آغاز براہِ راست اس سوال سے کیا: "موجودہ سیاسی حالات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" اُن کا جواب سُن کر میں سکتے میں آگیا۔ وہ میری طرف خشونت سے دیکھتے ہوئے بولے: "تمھارا مطلب کیا ہے؟ تم مجھ سے اِس طرح کا سوال کیوں پوچھتے ہو؟ اگر برطانیہ کا وزیر اعظم اپنے کمرے میں بیٹھا ہو تو کیا کوئی فرانسیسی یا جرمن یا روسی سیدھا اُن کے کمرے میں گھس کر اس طرح کا سوال کرنے کی جسارت کرے گا؟ اور بالفرض ایسا ہو بھی تو کیا تم سمجھتے ہو کہ برطانوی وزیر اعظم ایسے سوال کا کوئی جواب دے گا؟" میں نے اُن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اِس وقت نہ تو میں کوئی لیڈر تھا نہ ہندوؤں کا نمائندہ اور نہ ایک ہندو کی حیثیت سے بات کرنے آیا تھا۔ میری مُلاقات اور گفتگو کی بُنیاد تو ہماری بائیس سال کی

دوستی تھی - اور پھر اس مسئلے پر اگر میں اُن سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتا بھی تھا تو اس میں حرج ہی کیا تھا؟ اس پر جناح نے کہا کہ سیاسی معاملات کے بارے میں وہ کسی ہندو سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں - میں نے مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں سر پرشوتم داس سے بات کریں لیکن اُنھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا کیونکہ اُن کے خیال میں سر پرشوتم داس ہندوؤں کو متاثر نہیں کر سکتے تھے - مزید سوالات کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ہندو قوم پر نہ تو جواہر لال کا اثر ہے نہ سوبھاش بوس کا؛ البتہ گاندھی جی کا اثر ضرور ہے، ولبھ بھائی کا بھی اثر ہے مگر منفی کیونکہ وہ نقصان تو کر سکتے ہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتے ہیں اور نہ پہنچانا چاہتے ہیں - اُس دن میں نے محسوس کیا کہ جناح میں پہلی سی بات نہیں رہی - میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے دل میں اس قدر تلخی نہ پیدا ہونے دیں کیونکہ اس کا حاصل کچھ نہ ہوگا - اُن کی گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کانگریس نے اُن کو بُری طرح جھنجھوڑ دیا ہے اور وہ اس بدسلوکی کو نہ تو بھلانے کے لیے تیار تھے اور نہ معاف کرنے پر آمادہ - مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ جناح بے حد دکھی اور بیزار ہو گئے تھے -

"ہندوستان چھوڑ دو"

واقعات تیزی سے بدلتے گئے - مسلم لیگ نے سن ۱۹۴۰ میں مطالبۂ پاکستان پیش کر دیا - ۱۴ جولائی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تجویز منظور کی - اس تجویز کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ دینے کے بعد ملک کی اہم

سیاسی جماعتیں مل کر ایک دستور ساز اسمبلی بنائیں گی۔ اس طرح گویا ایک حد تک مسلمانوں کے مطالبے کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں گاندھی جی یا جواہر لال نہرو نے جناح سے ربط قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہی تجویز ۸ اگست ۱۹۴۲ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس میں منظور ہوئی جس کے دوسرے ہی دن سارے کانگریسی لیڈر جیل بھیج دیے گئے۔

کانگریس سے شکایت ۲۸ اگست ۱۹۴۲ کو جناح سے میری ۹۰ منٹ تک ملاقات رہی۔ میں نے اُن سے شکایت کی کہ بالفرض ان کے خیال کے مطابق کانگریس غلطی پر تھی پھر بھی اُن کی ضد اور لڑنے کا انداز میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ جناح کے مجھ جیسے دوست اُن سے کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کی توقع رکھتے تھے۔ اس کے جواب میں جناح نے اُلٹی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس جب کبھی اُن سے بات چیت کرنا چاہتی ہے تو گاندھی جی کے مشورے سے کسی غیر اہم شخصیت کو بھیجنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ جناح کا کہنا تھا کہ دراصل کانگریس کی ذہنیت ہی سراپا غلط تھی۔ وہ صورتِ حال کی حقیقتوں کو سمجھ نہیں رہی تھی، اس لیے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے مشترک فریقِ مقابل، یعنی برطانیہ کو ہندوستان پر اپنا اقتدار جمائے رکھنے کا موقع ملتا جا رہا تھا۔ جناح نے بڑی شدومد کے ساتھ کہا کہ حصولِ آزادی کی تمنا میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں؛ ملک میں برطانوی راج جاری رکھنے کی ذمّہ داری کانگریس پر ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ کانگریس کے موجودہ رویّے سے یا تو برطانوی اقتدار کی مدّت

بڑھتی جائے گی یا ان کی جگہ جاپانی لے لیں گے۔

راجاجی

جناح نے مجھے بتایا کہ تقریباً تین مہینے ہوئے راجا گوپال آچاریہ اُن سے دلی میں ملے تھے۔ راجاجی کے بارے میں جناح کا خیال تھا کہ کانگریس میں وہ ایک بہترین فرد ہیں، ذہین ہیں، صلاحیت، لیاقت اور خدمات کا ریکارڈ رکھتے ہیں؛ وہ سمجھوتے کے لیے بے حد کوشاں ہیں لیکن کانگریس نے انھیں کیا دیا؟ وہ (جناح) خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے: "انھیں پارٹی سے نکال باہر کیا!" راجاجی بہت پُراُمید ہوکر گاندھی جی سے ملنے وردھا گئے تھے۔ انھیں بھروسہ تھا کہ گاندھی جی، جناح کی باتیں مان لیں گے لیکن گاندھی جی نے اِنکار کر دیا۔

پاکستان کا تصور

جناح نے یہ بات زور دے کر کہی کہ اُن کے پاکستان کا مقصد "پین اِسلامزم" ہرگز نہیں ہے۔ وہ پاکستان کو ہندوستان کے جُغرافیائی حدود کے اندر دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ اُمورِ خارجہ کے معاملے میں ہندوستان اور پاکستان مِل جُل کر کام کیا کریں۔ انھوں نے یہ دلچسپ بات بھی بتائی کہ صوبہ بمبئی میں مُقیم ہونے کی وجہ سے خود اُن کی حیثیت اقلیت کے ایک رُکن کی ہوگی حکومت کے نظم و نسق میں اُنھیں کوئی مقام حاصل نہ ہوگا سوائے اس کے کہ اُن کے تجربے، علم اور تدبّر سے استفادہ کی غرض سے اُنھیں حکومت میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے ــــ حقیقت میں جناح نہ تو پاکستان جانا چاہتے تھے نہ وہاں مستقل سکونت اختیار کرنا چاہتے تھے اور نہ آزاد

مملکتِ پاکستان کے سربراہ بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اُنھیں پاکستان کے وجود میں آنے کا گمان بھی نہیں تھا۔

مایوسی اور اضمحلال

اس گفتگو کے دوران میں مجھے ایسا لگا کہ جناح مضمحل، رنجیدہ اور اپنے آپ کو بڑی حد تک تنہا محسوس کر رہے تھے۔ مجھے اُن کی صاف گوئی پسند آئی۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا کہ اُنھوں نے بمبئی میں انگریزوں کے غیر سرکاری طبقے میں سے کبھی کسی سے ملاقات کی؟ جناح نے جواب میں بتایا کہ سرکاری یا غیر سرکاری انگریزوں میں سے نہ تو کوئی اُن سے ملنے آیا اور نہ وہ اُن میں سے کسی سے ربط قائم کر سکے۔

میں نے اور سوالات کیے کیونکہ میں مجوزہ پاکستان کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ اس پر اُنھوں نے بڑی حسرت سے جواب دیا: "ائی ڈیئر کانجی، میں کانگریس کی طرف سے ایک اشارا چاہتا تھا۔ صرف ایک دوستانہ اشارا! لیکن مجھے وہ بھی حاصل نہ ہوا۔ اگر یہ اشارا مل جاتا تو ہمارے مسائل کا حل ہو جانا کوئی دشوار بات نہ تھی۔" میرا خیال ہے کہ جناح اپنے آپ کو کمزور اور متزلزل محسوس کرنے لگے تھے — اس لیے معقول اور مناسب شرطوں پر وہ کانگریس سے سمجھوتا کرنے پر نظر آتے تھے۔ مگر دقت یہ تھی کہ کانگریسی رہنما جیل میں بند تھے۔ چنانچہ اگلے تین برس تک کوئی ایسا موزوں شخص سامنے نہ آیا جو جناح اور کانگریس کے درمیان گفتگو شروع کرا سکتا۔ اس عرصے میں جناح نے اپنی طاقت کو مضبوط کرنے پر توجہ دی۔

راجاجی اور گاندھی جی

۹ فروری ۱۹۴۳ سے گاندھی جی نے آغا خاں پیلس میں اکیس دنوں کا برت شروع کیا جس کا مقصد انھوں نے تزکیۂ نفس بتایا۔ برت کے خاتمے پر راجاجی اُن سے ملے اور جو فارمولا اُنھوں نے پیش کیا اُسے گاندھی جی نے قبول کرلیا۔

۲۴ اپریل ۱۹۴۳ کو نئی دلی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ خطبۂ صدارت میں جناح نے کہا کہ اگر گاندھی جی واقعی اب مسلم لیگ سے سمجھوتا کرنے پر رضامند ہیں تو وہ بھی اس کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کریں گے۔ انھوں نے گاندھی جی کو یہ بھی مشورہ دیا کہ جس طرح وہ (گاندھی جی) وائسرائے سے خط و کتابت کر رہے تھے اُسی طرح اُن کو (جناح کو) بھی وہ اپنی تجویزیں لکھ بھیجیں۔ اِس مشورے کی تعمیل میں گاندھی جی نے حکومت کو لکھا کہ وہ اُن کے خطوط جناح کو بھی بھیج دیں۔ حکومت نے اِس بات کی اطلاع تو جناح کو دے دی لیکن خطوط نہیں بھیجے۔

کُل ہند قیادت

جناح جب دلی سے لوٹے تو میں اُن سے ملنے گیا۔ اس موقع پر میں نے کہا کہ میرے خیال میں کانگریس کا رویّہ قطعی طور پر منفی ہو چکا ہے، جس سے ملک کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ اِس طرح سوراج نہیں ملے گا۔ کیوں نہیں وہ صرف مسلمانوں کی قیادت کے بجائے کُل ہند پیمانے پر سب فرقوں کی قیادت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں؟ میں نے اُنھیں یاد دلایا کہ ہوم رول لیگ کے زمانے میں اور اس سے قبل بھی فی الواقع وہ کل ہند

سطح کے لیڈر رہ چکے ہیں اور آج بھی ہندو مسلمان اور دوسرے فرقوں کی غیر کانگریسی جماعتوں کو وہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے وہ جناح کی قیادت حاصل کرنے کے لیے اُن کی طرف آس لگائے بیٹھے ہیں۔ جناح نے کہا کہ انھوں نے بھی ہندوؤں کے رویّے میں خوشگوار تبدیلی محسوس کی ہے، پھر وہ بولے کہ راجا جی، جی۔ ڈی۔ برلا، سری رام اور سر پرشوتم داس ٹھاکر داس اُن سے دلّی میں ملے اور طے پایا کہ سب مل کر کام کریں گے۔ دوسرے روز جب میں سر پرشوتم داس اور جی۔ ڈی۔ برلا سے علاحدہ ملا تو دونوں کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ میں اُن کی اور جناح کی ملاقات سے واقف تھا۔ اُن لوگوں نے مجھے بتایا کہ جو باتیں ہوئیں وہ ایسی نہیں تھیں جنھیں ضبطِ تحریر میں لایا جا سکے۔ اس وقت جبکہ گاندھی جی اور کانگریسی لیڈر جیل میں بند تھے اور ان کے ساتھ معاملے کی بات بھی نہیں کی جا سکتی تھی، ان تجویزوں کو کوئی عملی شکل دینا ممکن نہ تھا۔

اقتصادی بہبودی

۱۴ جنوری ۱۹۴۴، جمعہ کا دن تھا۔ جناح سے میری پون گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ اس موقع پر میں نے ہندوستان کی معاشی ترقی کے مسئلے پر ٹاٹا پلان کا ذکر کیا۔ اس کے علاوہ سر ڈشوے سریا پلان اور ڈاکٹر جان متھائی کی تجویزوں کا بھی ذکر آ گیا۔ پھر میں نے اُن تقریروں کا بھی ذکر چھیڑا جو جناح نے کراچی اور دوسرے مقامات پر کی تھیں، جن میں جناح نے بار بار

کہا تھا کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی خاطر وہ ایک پروگرام تیار کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض سے ایک کمیٹی آف ایکشن کے تقرر کا مسئلہ بھی اُن کے زیرِ غور ہے۔ میں نے انھیں سر ایم۔ وشوے سریا کے دو پمفلٹ دیے جن میں صنعت کو فروغ دینے کی تجویزیں تھیں۔ میں نے جناح کو سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا فائدہ اِسی میں ہے کہ سارے مُلک میں صنعتی ترقی ہو تاکہ سب صوبوں کے مسلمان اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کا موقع ملے اور یہ اسی حالت میں ممکن ہے جبکہ مُلک کو ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم نہ کیا جائے۔ اس وقت تک جناح اُن اسکیموں سے واقف نہ تھے۔ انھوں نے میرے تجزیے سے اتفاق کیا اور مجھے وہ سارا لٹریچر بھیج دینے کو کہا جن کا ذکر گفتگو میں آیا۔ میں نے انھیں جے۔ آر۔ ڈی۔ ٹاٹا سے ملنے کا مشورہ دیا جو انھوں نے قبول کر لیا۔

جناح کا قصور کیا تھا؟

اُس دن کی گفتگو سے میری وضاحت کے بغیر وہ میرا مطلب سمجھ گئے۔ پھر میں نے اُن سے وہ سوال کیا جو مطالبۂ پاکستان کے معاملے میں بار بار کیا جاتا تھا۔ اگر پاکستان بن گیا تو دفاع یا بیرونی حملے کی صورت میں اُس کی خارجہ پالیسی کیا ہوگی؟ اس مرتبہ بھی اُن کا جواب وُہی تھا جو وہ پہلے دے چکے تھے۔ پھر بڑے درد بھرے انداز میں جناح نے مجھ سے پوچھا: "مائی ڈیئر کابجی' یہ تو بتاؤ آخر جناح کا قصور کیا ہے، جس کی سزا میں اُس کے خلاف اتنا زہر اُگلا جا رہا ہے اور غلط بیانیوں سے طرح طرح کی غلط فہمیاں

پھیلائی جا رہی ہیں؟ ہندو پریس کیوں میرا دشمن ہو گیا ہے؟ تمھارے ہندو دوست کیوں میری نیت پر حملے کر رہے ہیں؟ کیوں وہ مجھے غدار بتا رہے ہیں؟ وہ میرے پچھلے کارناموں کا ریکارڈ کیوں فراموش کر رہے ہیں؟ وہ مجھے اتنا احمق کیوں سمجھ رہے ہیں کہ میں برطانوی حکومت کے ہاتھوں کھیل کر اس بّرِ صغیر کو آزادی سے دُور دھکیل رہا ہوں؟ میں نے کیا مانگا؟ میرے مطالبے میں کون سی غیر معقول بات ہے؟ میں نے پاکستان مانگا لیکن یاد رکھو، میں تو پاکستان کا صرف اُصول تسلیم کرانا چاہتا ہوں۔ کون سی بُرائی میں نے کی؟ کیا ہندو کانگریس اور ہندو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اگر وہ اور ہم ایک دوسرے سے تعاون کریں تو اپنے مشترک دشمن کو اپنے ملک سے باہر نکال سکتے ہیں؟ اگر ایک بار باہمی تعاون کے اُصول پر اتفاق کر کے ہم انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر دوسری تفصیلات بھی آپس میں طے کر لیتے!"

گاندھی جی کی رہائی کی کوشش

اِس کے بعد جناح نے تفصیل کے ساتھ اُس خط کا ذکر کیا جو گاندھی جی نے اُن کو پچھلے سال لکھا تھا۔ پھر اُنھوں نے مسلم لیگ کے ۱۹۴۳ کے اجلاس کے خطبۂ صدارت سے بعض اقتباسات پڑھ کر سنائے اور کہا: "ہاں یہ درست ہے کہ میں گاندھی جی کی طرف سے ایک تحریر چاہتا تھا، یہ بات میں نے اپنے خطبے میں بھی کہی تھی۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ میں گاندھی جی کی قید سے رہائی کی کوشش کرتا۔ اگر وہ مجھے ایک تفصیلی

خط اُس طرح کا لکھ دیتے جس کے اشارے میں نے اپنے خطبے میں کیے تھے تو اُس بنیاد پر مجھے اُن کی رہائی کے لیے احتجاج کرنے کا موقع مل جاتا۔ لیکن اس کے بجائے گاندھی جی نے میری دیانت دارانہ اور مخلصانہ پیشکش سے غلط فائدہ اُٹھانا چاہا مگر میں اُن کے جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہ تھا۔"

جناح نے مجھے بتایا کہ ۱۹۲۴ میں گاندھی جی کی جیل سے رہائی میں اُن کی کوششوں کو کتنا دخل تھا۔ یہاں لقمہ دیتے ہوئے میں نے کہا "اور ستمبر ۱۹۱۷ میں مسز بیسنٹ کی نظربندی سے رہائی بھی آپ ہی کی کوششوں کی رہینِ منت تھی" اِس پر وہ بولے "لیکن مسز بیسنٹ تو میری لیڈر تھیں، میں اُن کا صرف ایک سپاہی تھا۔ سپاہی کی حیثیت سے یہ میرا فرض تھا کہ اُنھیں دوبارہ اپنے ساتھیوں کے درمیان لا کر اُن کی قیادت میں اپنا کام جاری رکھتا —— وہ بڑی عظیم لیڈر تھیں! اُن کے ساتھ کام کرنے میں خوشی بھی ہوتی تھی اور فخر بھی۔ اُن دنوں ہم کیسے مل جل کر کام کیا کرتے تھے!"

اس کے بعد جناح نے ۱۹۳۶ کی اُس بات چیت کا ذکر کیا جو بھولا بھائی ڈیسائی، ستیا مورتی اور گووند ولبھ پنت کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ سب مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ارکان تھے۔ جناح نے بتایا کہ اُس گفتگو میں یہ طے پایا تھا کہ گرچہ "کمیونل ایوارڈ" کو وہ سب ناپسند کرتے ہیں لیکن اِس کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ سب کسی ایسے متفقہ سمجھوتے

کے لیے کوشاں تھے، جو نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے حق میں منصفانہ ہو بلکہ جس کی وجہ سے آگے چل کر اِن دو بڑے فرقوں میں مل کر کام کرنے کی صورت پیدا ہو سکے۔ بھولا بھائی، ستیا مورتی اور پنت نے یہ مسئلہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے توثیق کے لیے پیش کیا لیکن گاندھی جی اور نہرو نے اس طرح کی باتیں سُننے تک سے انکار کر دیا۔

راجاجی جناح کی نظر میں

جناح نے مجھ سے کہا کہ وہ راجاجی کو ایک شریف، مخلص، ایماندار اور خوش اسلوب آدمی سمجھتے ہیں۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ کاش راجاجی جرأتِ رندانہ سے کام لے کر گاندھی جی کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو سکتے۔ جناح کے الفاظ یہ تھے:

"راجاجی بڑے پیارے آدمی ہیں، میں اُنھیں بے حد پسند کرتا ہوں —— مجھے اُن پر افسوس بھی ہوتا ہے۔" اُن کا خیال تھا کہ گاندھی جی کے مقابلے میں نہرو سے نپٹنا نسبتاً زیادہ آسان تھا۔

طبقاتی کشمکش

اِس کے بعد میں نے جناح سے اُس کشمکش کا ذکر کیا جو اُن کی ذاتی مخاصمت کی بنیاد پر شروع ہو رہی تھی —— مسلم لیگ میں مسلمان زمینداروں اور کسانوں اور بے روزگار نوجوانوں میں خاصا اختلاف شروع ہو چکا تھا۔ میں نے خاص طور پر پنجاب اور کراچی کا ذکر کیا تو انھوں نے جواب دیا: "تم مجھے سالہا سال سے جانتے ہو، کیا میں نے مفاد پرستوں کی کبھی پروا کی ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان زمینداروں کی مجھے ذرہ برابر بھی پروا ہے؟ سُن لو، مسلم لیگ میں کوئی کشمکش نہیں ہے۔ مسلمان نوجوان طبقہ

مجھ سے ہرگز بغاوت نہیں کرے گا۔ یہ سب باتیں ایک طرح کی خوش اندیشی پر مبنی ہیں۔ اس طرح کی افواہیں پھیلا کر ہمارے دشمن ہمیں کمزور کر دینا چاہتے ہیں۔ اس سے اور تو کچھ نہیں، اُن کا مسخرہ پن ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں فضول ہیں۔

لیڈروں کی کم ہمتی

پھر جناح نے مجھے بتایا کہ وہ کئی نامور ہندوؤں کی زبان سے سنتے رہے ہیں کہ کانگریس سراسر غلطی پر تھی لیکن سب کے سامنے یہی بات کھل کر کہنے کی ہمت اُن میں نہیں تھی۔ جناح نے کہا: "اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ جیل سے باہر بہت سے کانگریسی لیڈر موجود ہیں، جو اس معاملے کو آگے بڑھا کر مسلم لیگ سے سمجھوتا کر سکتے ہیں، صرف ہمت کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی کی تھوڑی سی مخالفت کرنے کی ہمت!"

جناح کے نام خط

اگست ۱۹۴۴ میں گاندھی، جناح بات چیت ہونے والی تھی، لیکن جناح کی علالت کے سبب ملتوی ہو گئی۔ اس سلسلے میں ۱۶ اگست کو میں نے جناح کو لکھا تھا:

"گاندھی جی اور آپ کی ملاقات کے موقع پر، ہندو مسلم اتحاد اور ملک کو آزادی سے قریب لانے کی عظیم مشن کی کامیابی کے لیے آپ کی خدمت میں اپنی نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں۔ گزشتہ جنوری کی گفتگو مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے اپنے دوستوں سے بھی کہا کہ جہاں تک آپ کا تعلق ہے کسی بھی باعزت سمجھوتے کی راہ میں آپ ہرگز رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ مجھے خوب یاد ہے، آپ نے کہا تھا کہ ہندوؤں کی طرف سے آپ کوئی اشارا چاہتے ہیں،

جس کے بعد باقی باتیں آسان ہوجائیں گی۔ تفصیلات پر بعد میں بحث ہوسکتی ہے۔ اب وہ اشارا گاندھی جی کی طرف سے مل رہا ہے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ مالویہ، شاستری اور بعض دوسرے لیڈروں کی مخالفت اور فری پریس جرنل کے حمائتی، کانگریسی سوشلسٹوں کے سخت احتجاج کے باوجود، گاندھی جی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے۔ اس کا بھی پورا امکان ہے کہ آپ انھیں اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوجائیں۔ اس موقع کو کسی طرح ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ جب میں آپ کے بارے میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ وطن پرستی اور حریت پسندی کے جذبے میں آپ بڑے سے بڑے کانگریسی لیڈر کے بھی مقابلے میں کم نہیں ہیں تو میں کوئی نئی بات نہیں کہتا ہوں۔ جیسا کہ آپ خود مجھ سے کہہ چکے ہیں، برطانوی حکومت موجودہ ہندو مسلم کشمکش سے پوری طرح فائدہ اٹھا رہی ہے، وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی ہے کہ ان دو بڑے فرقوں میں کوئی سیاسی اتفاق ہو۔ اصلی نکتہ یہ ہے کہ جنگ[1] کے اختتام سے پہلے ہی حکومت پر پورا پورا دباؤ ڈالنا چاہیے ورنہ انگلستان کو بعد میں ہماری نا اتفاقی اور کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا پھر سے موقع ملے گا۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

"آپ کی توجہ ایک اور بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

---

[1] دوسری عالمی جنگ

کچھ دن ہوئے میں نے "ہندو" میں آپ کی سوانح حیات پر ایک تبصرہ پڑھا - اُس میں اس بات کا اشارا تھا کہ رتی کے ساتھ شادی کے موقع پر آپ کو سسرال سے تیس لاکھ روپے ملے تھے، حالانکہ یہ ایک لغو اور سراسر بے بنیاد بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ "ہندو" اور تبصرہ نگار کے نام ایک تردیدی بیان دے دیں تو مناسب ہوگا۔"

گاندھی جناح ملاقات

ستمبر کے آخری ہفتے اور اکتوبر کے دو ہفتوں میں گاندھی جناح ملاقات ہوئی - بعد میں ان دونوں کی خط و کتابت بھی شائع ہوئی، جس کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پہلے دن ہی کی گفتگو میں ظاہر ہوگیا تھا کہ ان دونوں میں سمجھوتے کا کوئی امکان نہ تھا۔ پھر بھی بے وجہ اور بے ضرورت ملک کو تین ہفتوں تک امید و بیم کی کیفیت میں رکھا گیا اور جب نتیجے کا اعلان ہوا تو چاروں طرف مایوسی اور افسردگی کی فضا چھاگئی - میں اس ناکامی پر جناح کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۴ کو اُن سے ملاقات کی اور اپنی عادت کے مطابق اُس دن کی گفتگو گھر آکر نوٹ کرلی - میں نے جناح سے دریافت کیا کہ آئندہ وہ کون سا قدم اُٹھائیں گے؟ برطانوی حکومت کے مقابلے میں اُن کا رویہ کیا ہوگا؟ جناح جب بولنے لگے تو میں نے اُن میں ایک نئی چیز پائی۔ وہ باتیں کرتے کرتے نچلے ہونٹ کو دباتے رہے، ان کے ہونٹوں میں ارتعاش تھا - یہ علامتیں تھیں اُن کی اعصابی بے چینی اور احساسِ تنہائی کی - میں اُن سے ڈھائی فیٹ کے فاصلے پر بیٹھا تھا پھر بھی

اُن کی آواز سُننے اور سمجھنے کے لیے کانوں کو معمول سے زیادہ متوجہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ اِتنا آہستہ بول رہے تھے کہ جیسے وہ اپنے آپ ہی سے بول رہے ہوں۔ بولتے وقت وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے بلکہ اُن کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں کہیں دُور ٹکٹکی لگائے تھیں۔ بات چیت کی ناکامی سے جناح کو جو رنج پہنچا تھا اس کے تکدّر اور تکلیف کے آثار اُن کے چہرے سے عیاں تھے۔ وہ تھوڑے ہی دن پہلے انفلوئنزا سے اچھے ہوئے تھے. دیکھنے میں صحت مند لگتے تھے لیکن بہت کمزوری محسوس کر رہے تھے؛ کافی دُبلے بھی ہو گئے تھے۔ دورانِ گفتگو میں بار بار میں دَخل دیتا رہا لیکن اِس کا اُنھوں نے بُرا نہ مانا۔ بیچ بیچ میں جو سوالات میں کر رہا تھا، ان کے الفاظ کے انتخاب میں کافی احتیاط برت رہا تھا تاکہ انھیں یہ گمان نہ گزرے کہ میں جرح کر رہا ہوں۔ میں اُن کے جذبات کو کسی طرح ٹھیس لگانا نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان دنوں میں بھی میں اُن چند مخصوص لوگوں میں تھا جو جناح سے مساوی سطح پر بالکل دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ دوسرے احباب یا تو انھیں رنج پہنچا کر یا پھر اُن سے خفا ہو کر دُور ہٹ چکے تھے۔ جناح بہت ہلکی اور نحیف آواز میں بولے "گاندھی کیوں آئے تھے؛ جب وہ مجھے دینے کے لیے کچھ ساتھ نہیں لائے تھے، تو پھر میرے پاس کیوں آئے؟" اُن کی آواز سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ سوال اپنے آپ سے پوچھ رہے ہوں۔ اُنھوں نے یہ سوال کوئی دس بارے

کم نہیں دُہرایا۔

میں نے اُن سے پوچھا "کیا آپ کے خیال میں گاندھی جی کوئی شاطرانہ چال چلنا چاہتے تھے؟ کیا آپ کو وہ ایسی پوزیشن میں ڈال دینا چاہتے تھے کہ جہاں رائے عامۃ آپ کے خلاف ہو جاتی؟" جناح نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا: "نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ میں یہ بات ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی نے بڑی صاف صاف بات کی۔ اس بارے میں مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

ناکامی کے بعد

میں نے جناح سے پوچھا "اب کیا ہوگا؟" جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا کہ برطانوی حکومت، بات چیت کی ناکامی سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گی، اِس پر خوش ہوگی، بیرونی ممالک میں ہندوستان کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائے گی اور اس طرح اپنی استبدادی حکومت جمائے رکھے گی۔ جناح نے جواب دیا، "میں تم سے اتفاق کرتا ہوں، لیکن تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ چونکہ برطانوی حکومت صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے والی ہے، اس لیے میں خودکشی کرلوں؟ یاد رکھو میں خودکشی کے مقابلے میں لڑتے ہوئے جان دینا زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

میں نے اُنھیں نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ خودکشی کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بات صرف معاملے کو سُلجھانے کی ہے۔ میری رائے ہے کہ جنگ کے خاتمے پر برطانیہ کی پوزیشن

بین الاقوامی دُنیا میں کمزور پڑ جائے گی ؛ اور ہندوستان پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ میرے پوچھنے پر کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ وہ بولے "سمجھاؤ، سمجھاؤ" میں نے کہا "کیسے سمجھایا جائے؟" اُنھوں نے جواب دیا "پہلے ہندوؤں کو سمجھاؤ پھر برطانیہ کو سمجھاؤ!" اِس پر میں نے پوچھا "کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا کی رائے آپ کی موافقت میں ہو جائے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا مع امریکہ، آپ کے مطالبۂ پاکستان کو برحق تسلیم کرلے؟" جناح نے جواب دیا کہ انھیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ امریکہ کیا چاہتا ہے۔ اُن کی خواہش صرف اِتنی ہے کہ ہندو اور برطانیہ اُن کے مطمحِ نظر کو پوری طرح سمجھ لیں۔

مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس مسئلے کا تسلی بخش حل نکلے گا۔ اِس بارے میں جناح سے میں نے پوچھا تو وہ بولے "مجھے تم سے اتفاق ضرور ہے لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ وقت کتنی تیزی سے نکلا جارہا ہے؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس درمیان میں تلخی کتنی بڑھ رہی ہے؟ اگر سمجھوتا جلد نہ ہوا، مصالحت جلد نہ ہوئی تو پھر ایک ساتھ کام کرنے کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوستی ختم ہو جائیگی اور تلخی باقی رہ جائے گی۔ امریکہ کا حال دیکھو۔ آج بھی امریکہ کے لوگ انگریزوں کو شُبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اُن میں تنقید، نکتہ چینی اور ایک دوسرے کی عیب جوئی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اِس کا سبب صرف اتنا ہے کہ امریکیوں کا مطالبۂ آزادی برطانیہ نے وقت پر تسلیم نہیں کیا تھا۔ امریکیوں کو لڑکر آزادی حاصل

گرنی پڑی اس لیے اتنی مدت گزر جانے پر بھی آج تک امریکن، انگریزوں کو اچھا نہیں سمجھتے ہیں !

نیا بنگلہ

۵ نومبر ۱۹۴۵ کو دیوالی تھی۔ میں وقت مقرر کیے بغیر اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر جناح کے یہاں دیوالی مبارک کہنے کے لیے پہنچ گیا۔ انھوں نے اپنے نئے بنے ہوئے بنگلے کی پہلی منزل پر بلا لیا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر واقعی وہ پاکستان چاہتے تھے اور اس کے حصول کا انھیں یقین تھا تو پھر پرانے مکان کی از سر نو تعمیر پر کئی لاکھ روپے خرچ کرنے کے کیا معنی تھے ؟ مارچ ۱۹۴۴ میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس پرانے مکان کو فروخت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جتنی قیمت وہ چاہتے تھے اتنی نہیں ملی اس لیے انھوں نے خیال ترک کر دیا۔ اس کے بعد پھر اتنی بڑی رقم کا خرچ کرنا کیا اس بات کا اشارا نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے وجود میں آجانے پر یقین کامل نہیں رکھتے تھے ؟ نومبر ۱۹۴۵ تک بھی جناح کا اس بنگلے کو چھوڑ کر کراچی میں جا بسنے کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔

کانگریس سے شکایت

اسی دن جناح سے ایک اور دلچسپ بات ہوئی۔ موتی لال سیتلواد سے (جو حال تک ہندوستان کے اٹارنی جنرل تھے) کانگریس نے چاہا کہ وہ لیجس لیٹو اسمبلی کے لیے بمبئی کی دو نشستوں میں سے ایک کے لیے امیدوار ہو جائیں۔ سیتلواد پہلے تو رضامند ہو گئے لیکن جب کانگریس نے ان سے اپنے عہدنامے پر دستخط لینے چاہے تو انھوں نے منظور نہیں کیا۔ میں نے اس کا ذکر جناح کے سامنے کیا تو وہ بولے " کتنا اچھا ہوتا اگر وہ بھی اسمبلی کے ممبر ہو جاتے،

مجھے اُن کے ساتھ کام کرنے میں بڑی خوشی ہوتی "۔ اِن الفاظ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اُن دنوں وہ پاکستان کے مطالبے پر بہت زیادہ مُصِر نہ تھے۔ دورانِ گفتگو میں انھوں نے شکایت کی کہ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات میں کانگریس لاکھوں روپے ایسے مُسلمانوں پر خرچ کر رہی ہے جو اپنے کو "نیشنلسٹ مسلمان" کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ ایسے نہیں ہیں۔ انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا کہ کانگریس ایک بھی نیشنلسٹ مسلمان کو کامیاب نہیں کرا سکے گی، ہر نشست پر مسلم لیگ کا قبضہ ہو جائیگا۔ جناح کو اس کی بھی شکایت تھی کہ جواہر لال نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل اپنی تقریروں میں اُن کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ آگے چل کر انتخابات کے نتیجوں سے پتہ چلا کہ جناح کی لیڈری اور مسلم لیگ کا اِقتدار ناقابلِ تردید حقیقت تھی۔ وہ بلاشُبہ مسلمانوں کے نمائندے تھے اور کانگریس اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

یادداشت میں جناح کا ذکر

ڈیوڈ گراہم پول کے کہنے پر برطانوی لیبر پارٹی کے لیے میں نے ۲۸ نومبر ۱۹۴۵ کو ۵۳ صفحوں کی ایک یادداشت مرتب کی تھی جس کا عنوان تھا "ہندوستان، اپریل ۱۹۴۴ تا ۱۹۴۵ — آگے کیا ؟" ۔ اس کے آخری حصّے میں مَیں نے جناح کے بارے میں یہ لکھا تھا :

" ۵ نومبر کو میں جناح سے ملا۔ پچھلے چھ سال کے مقابلے میں اس بار میں نے اُنھیں تندرستی کے لحاظ سے اور مزاج کے لحاظ سے بھی بہتر پایا۔ اکتوبر ۱۹۴۴ میں وہ چڑچڑے اور تنگ مزاج

ہو گئے تھے ۔ اُن کی طبیعت بگڑی بگڑی سی تھی اور وہ بیمار معلوم ہوتے تھے ۔ اِس مرتبہ وہ ہشاش بشاش نظر آئے ۔ کانگریس نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ناروا تھا ۔ جولائی میں برطانوی حکومت نے اپنے فیصلے انھیں پر چھوڑ دیے تھے جس کی وجہ سے وہ اپنے رویّے میں اور زیادہ سخت ہو گئے تھے ۔"

یادداشت کا آخری حصّہ یہ تھا :

"خاتمۂ کلام کے طور پر میں لیبر گورنمنٹ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انھیں عملی قدم ابھی اور فوراً اُٹھانا چاہیے ۔ چار پانچ مہینے اگر اور نکل گئے تو پانی سر سے گزر جائے گا ۔"

امریکہ کی دعوت

۲۴ مارچ ۱۹۴۶ کو کیبنیٹ مشن ہندوستان آیا اور بہت جلد مختلف لیڈروں سے بات چیت میں مصروف ہو گیا ۔ اُنھیں دنوں مجھے امریکہ سے ایک دعوت موصول ہوئی جس کی وجہ سے مجھے اس ملک میں مزدوروں کے مسائل کے مطالعے کا موقع ملا ۔ سفر کی تیاری اور بعض سرکاری کارروائیوں کے لیے میں دِلّی گیا ۔

۱۸ اپریل کو صبح چھ بجے سردار پٹیل کے بنگلے پر اُن سے رخصت ہونے کے لیے گیا ۔ وہ میرے سفر کے بارے میں سُن کر خوش ہوئے ۔ کیبنیٹ مشن کے ارکان اُن دنوں شملہ میں تھے ۔ سردار نے مجھے بتایا کہ شملے سے واپسی پر مشن ، کانگریس اور مسلم لیگ سے ایک عبوری قومی حکومت بنانے کو کہے گا اور کانگریس اس بات پر رضامند ہو جائے گی ۔ اگر جناح نے اس میں شریک ہونا منظور نہ کیا تب بھی کانگریس حکومت بنا لے گی ۔ میں نے سردار سے پوچھا کہ

وہ کن شرائط پر جناح سے سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں؟ میرے سوال کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح سردار سے ملاقات کا وقت مقرر کیے بغیر میں اُن کے یہاں چلا گیا تھا اسی طرح جناح کے یہاں بھی پہنچ جاؤنگا اور اُن کو سردار کی شرطوں سے آگاہ کردوں گا۔ سردار نے جواب میں کہا: "اب جناح کے ساتھ کسی سمجھوتے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جناح سے کہہ دینا کہ کانگریس اور برطانیہ کے درمیان معاملے پا چکا ہے۔ اب ہندوستان میں اُن کا کوئی مقام نہیں رہا۔" پھر وہ مذاق کرتے ہوئے بولے: "اور سنو! تم اُنھیں اپنے ساتھ امریکہ کیوں نہیں لیے جاتے ہو؟" گو بات مذاق میں کہی گئی لیکن اس سے سردار پٹیل کے سوچنے کا ڈھنگ ظاہر ہوتا ہے۔ اُن کا مقصد یہ جتانا تھا کہ ایک بار جب برطانیہ سے بات طے ہو چکی تو پھر جناح اور مسلم لیگ کے تعاون کی ضرورت ہی کیا تھی!

امریکہ کا سفر

میں ۳۰ مئی ۱۹۴۶ کو بحری راستے سے امریکہ روانہ ہوگیا۔ ۴۲ دنوں کے تکلیف دہ سفر کے بعد ۱۲ جولائی کو بوسٹن پہنچا۔ وہاں سے دوسرے مقامات پر گیا اور بے شمار لوگوں سے ملا۔ ڈیڑھ مہینے کے خوشگوار اور دلچسپ تجربے حاصل کرکے یکم ستمبر کو واشنگٹن آیا۔ دوسرے دن میں نے پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے نام ہندوستان کی زمام حکومت ہاتھ میں لینے پر مبارکباد کے خطوط لکھے۔[1]

---

[1] ۲ ستمبر کو عبوری حکومت بنائی گئی جس میں مسلم لیگ شریک نہیں ہوئی لیکن بعد میں وائسرائے کی کوششوں سے مسلم لیگ کے ارکان بھی نامزد کیے گئے۔ اور مخلوط قومی حکومت بنی۔ — م

۱۰ ستمبر کو سردار پٹیل کا یہ جواب آیا:

"تمھارا واشنگٹن سے ۲ ستمبر کا لکھا ہوا خط ملا۔ کافی تاخیر کے بعد آخر ہم نے حکومت کی ذمّہ داری سنبھال لی ہے لیکن اب تک مسلم لیگ کو ہم ساتھ نہیں لا سکے۔ اس منزل پر مسٹر جناح کا رویّہ بڑا افسوسناک ہے۔ اگر وہ دستِ تعاون بڑھا دیتے تو سارے ہندوستان کے لیے یہ دن 'یوم جشن' ہو جاتا۔ اس کے بجائے انھوں نے رکاوٹیں ڈالنا پسند کیا ہے....."

لندن میں جناح سے ملاقات

امریکہ سے روانہ ہو کر ۹ ستمبر کو میں لندن اس وقت پہنچا جب وزیرِ اعظم ایٹلی نے لارڈ ویول، پنڈت نہرو، جناح، لیاقت علی خاں اور بلدیو سنگھ کو ہندوستان کی سیاسی گتھی سلجھانے کے لیے وہاں بلایا تھا۔ اُن کی اس کانفرنس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں پندرہ دن لندن میں رہا۔ اس دوران میں جناح سے میری بیس منٹ کی ملاقات بھی رہی۔ میں نے انھیں پژمردہ، کمزور اور بیمار پایا۔ انھوں نے مجھ سے امریکہ کے سفر کی تفصیلات پوچھیں۔ پھر میں نے اُن سے کہا کہ میں سات مہینوں سے ہندوستان سے باہر رہا اس لیے مجھے پوری طرح علم نہیں ہے کہ میرے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اس پر وہ بولے "ملک؟ کیسا ملک اور کہاں کا ملک؟ ہمارے یہاں کوئی ملک نہیں ہے، صرف ہندو ہیں اور مسلمان ہیں۔"

میں نے محسوس کیا اب جناح، پاکستان کے سوا اور کسی بنیاد پر سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، وہ اپنی جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ کانگریسی لیڈروں نے اُن کی بری طرح توہین کی تھی۔

جناح نے بہار کے فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کیا اور کہا کہ کافی چھان بین کے بعد جو اعداد و شمار ملے اُن کے حساب سے مقتولین کی تعداد تیس ہزار کے قریب پہنچتی ہے۔ یہ اعداد و شمار مبالغہ آمیز تھے۔ نہرو نے اسمبلی میں دو ہزار کا اندازہ لگایا تھا۔

مسلم لیگ کا مطالبہ

چونکہ مسلم لیگ نے مجوزہ دستور ساز اسمبلی کا مقاطعہ کیا تھا اس لیے ولبھ بھائی پٹیل نے ایک تقریر میں اس بات کا مطالبہ کیا کہ اُصولاً مسلم لیگ کو جموری حکومت سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ جموری حکومت کے روزمرہ معمولات میں مسلم لیگ تعاون سے گریز کر رہی تھی۔ میں نے جناح سے پوچھا کیا یہ مناسب نہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی اور ملک کے دستور کے بارے میں مسلم لیگ چاہے جو رویہ چاہتی اختیار کرتی لیکن حکومت کے کاروبار اور ملکی بھلائی کی کوششوں میں ان جھگڑوں سے دُور رہتی؟ جناح نے جواب میں کہا: "کیا مطلب؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اس کمرے میں بیٹھ کر ہم اور تم ایک دوسرے سے پیار کی باتیں کریں اور باہر ایک دوسرے کے چھُرے گھونپیں!" اُن کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ نہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کے ارکان، جموری حکومت میں تعاون نہ کریں بلکہ یہ بھی کہ کانگریسی ارکان کے کاموں میں رکاوٹ ڈالیں۔

تلخی کا سبب

جب تک میں اُن سے باتیں کرتا رہا، جناح کا رویّہ نہایت دوستانہ رہا۔ انھوں نے بمبئی میں مجھے ملنے کو کہا اور یہ بھی یقین دلایا کہ میں جب چاہوں اُن سے مل سکتا ہوں۔ اُس وقت مجھے

محسوس ہوا کہ اگر کانگریسی لیڈروں نے اُن سے ذاتی تعلقات منقطع نہ کیے ہوتے تو اُن میں اس حد تک تلخی نہ آئی ہوتی۔ اُن کے وقار اور اُن کی شخصیت کو بہت صدمہ پہنچا تھا جس سے نہ صرف ان کے جذبات مجروح تھے بلکہ یہی اُن کی تلخی کا سبب بھی تھا۔ وہ اپنے اطراف عدم اعتماد اور شک و شبے کا جال بچھا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اُن کی فراست بہ دستور قائم تھی۔ وہ کم سخنی اور اپنے مخالفوں کو زیر کرنے کا پورا آرٹ جانتے تھے۔ نہرو جیسا نخوت پسند اور جذباتی آدمی بڑی آسانی سے اُس کا شکار ہو جاتا تھا۔ نہرو کی ایک کمزوری (جس سے جناح بھی واقف تھے) اُن کا لمبی تقریریں کرنے کا شوق تھا، جن میں وہ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جن سے فائدہ کے بجائے اُلٹا نقصان ہوتا تھا۔

ایٹلی سے ملاقات

۱۷ دسمبر کو وزیر اعظم ایٹلی سے میری پندرہ منٹ ملاقات رہی۔ ایٹلی نے کہا کہ کانگریس کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ کسی طرح جناح اور مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہو جائیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں جناح سے مل چکا ہوں اور میں نے اُن کا رویہ غیر واجبی پایا۔ میں نے ایٹلی کو بتایا کہ ہندوستان کے لیڈر نہرو نہیں بلکہ پٹیل ہیں۔ ایٹلی نے کہا وہ بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر کہ ہندوستان میں سردار پٹیل سے ملاقات کرنے پر میں اُن سے کیا کہوں؟ ایٹلی نے جواب دیا "پٹیل سے کہو کہ وہ طاقتور بھی ہیں اور بڑے بھی ہیں۔ انھیں چاہیے کہ جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ تھوڑی سی فیاضی برتیں اور انھیں دستور ساز اسمبلی میں لے آئیں؟

میں نے پوچھا کہ فرض کر لیجیے کہ پٹیل دستور ساز اسمبلی میں جناح کو شریک کرانے میں کامیاب ہو گئے تو کیا ان کے خیال میں جناح کا رویہ معقول ہوگا؟ اور کیا وہ تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ ایٹلی نے جواب دیا کہ ایک بار جناح نے دستور ساز اسمبلی میں شرکت کر لی تو پھر اُن سے نپٹنا آسان ہو جائے گا۔

ولبھ بھائی کا اعتراف

میں ۲۵ دسمبر کو کراچی ہوتا ہوا بمبئی واپس آیا۔ ۳۱ دسمبر کو احمد آباد میں پٹیل سے ایک طویل مُلاقات ہوئی۔ اس موقع پر انھوں نے اعتراف کیا کہ ایٹلی نے سمجھوتے کا جو مشورہ دیا تھا اسے قبول نہ کر کے کانگریس نے بڑی سخت غلطی کی ہے۔

۳ مارچ ۱۹۴۷ کو میں نے پٹیل کو ایک خط لکھا جس میں اُس گفتگو کا حوالہ تھا اور اس کے ساتھ ایک ایسے نوٹ کا بھی ذکر تھا جو میں نے لندن میں اپنے مذاکرات پر تیار کر کے بی۔ جی۔ کھیر کی معرفت انھیں بھیجا تھا۔ میں نے اس خط میں یہ بھی دریافت کیا تھا کہ میرے لیے جناح سے مِلنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ ملک کے سیاسی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے، دوسرے ہی دن مجھے ولبھ بھائی کا یہ جواب مِلا:

"مجھے تمھارا خط مورخہ ۳ مارچ آج مِلا۔ بالا صاحب کھیر نے تمھاری لندن کی بات چیت کے نوٹ دیے تھے۔ بلاشبہ لیبر حکومت نے ہمارے لیے اور دنیا کے سامنے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیا ہے لیکن اُن کے بیان سے[1] سرسری یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

---

[1] جو ۲۰ فروری کو شائع ہوا تھا۔

ہمارے ہاتھ سے پنجاب نکل گیا[1] لیکن مجھے پھر بھی تمھاری طرح قطعی مایوسی نہیں ہے۔ مسلم لیگ وہاں وزارت بنانے میں کامیاب ہو بھی گئی تو سال سوا سال سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ اگلے جون سے قبل یقینی طور پر دستور تیار ہو جائے گا۔ اگر لیگ نے پاکستان پر اصرار کیا تو پھر یہ ایک ہی صورت رہ جائے گی کہ پنجاب اور بنگال کا بھی بٹوارہ کیا جائے۔ وہ لوگ خانہ جنگی کے بغیر تو پورا پنجاب اور پورا بنگال ہرگز نہیں لے سکیں گے۔ میں نہیں سمجھتا برطانوی حکومت تقسیم پر رضامند ہوگی، وہ سب سے زیادہ طاقت ور پارٹی کو زمام حکومت سپرد کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اور اگر اس نے یہ بھی نہ کیا تو تقسیم کا مطالبہ تسلیم کرانے میں وہ کسی اقلیت کی مدد نہیں کرے گی۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ مشرقی بنگال، پنجاب کا ایک حصہ، سندھ اور بلوچستان کو چھوڑ کر باقی ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت اتنی طاقت ور ہوگی کہ بقیہ حصے مجبور ہو کر اس میں شامل ہو جائیں گے۔ جنگ کے بعد کے حالات کی بنا پر ساری دنیا میں مزدوروں کے جھگڑے کا اُٹھ کھڑا ہونا لازمی بات ہے اور ہم بھی اسی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔

میں نے تمھارا خط پنڈت جی کو دے دیا ہے۔"

خط کی اہمیت

یہ خط بے حد اہم ہے۔ ولبھ بھائی پہلی بار ملک کی

---

[1] خضر حیات خاں کی وزارت کے استعفیٰ سے مسلم لیگ کی پوزیشن بہتر ہو رہی تھی ۔۔ م

تقسیم پر رضامندی کا اظہار کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ پنجاب اور بنگال کے بٹوارے کا بھی - اس خط کی قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ خط لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان پہنچنے اور وائسرائے بننے سے تین ہفتے قبل کا لکھا ہوا ہے - ایسی صورت میں تقسیم ہند کی ذمّہ داری برطانوی حکومت یا ماؤنٹ بیٹن پر کیسے عائد کی جا سکتی ہے؟ پٹیل نے خود یہ لکھا تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتی۔

۱۸ مارچ کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک تجویز منظور کی جس میں برطانوی کیبنٹ مشن کی پیشکش اپنی تشریحات کے ساتھ منظور کی اور مسلم لیگ کو دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی - کاش جناح یہ دعوت قبول کر لیتے! مگر اُس وقت وہ کیبنٹ مشن کے سلسلے میں کانگریس کی دو عملی سے اس قدر بیزار ہو چکے تھے کہ انھوں نے اُس کی دعوت رد کر دی۔

گاندھی جناح کی آخری ملاقات

۶ مئی کو گاندھی جی اور جناح، نئی دلّی میں آخری بار ملے اور پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی اختلاف کرتے ہوئے ایک دوسرے سے جُدا ہوئے - جناح نے گاندھی جی کی مرضی سے یہ بیان شائع کیا:

"ہم دونوں نے دو مسئلوں پر بحث کی: پہلا مسئلہ ہندوستان کو پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کرنے کا تھا - مسٹر گاندھی تقسیم کے اُصول کو تسلیم کرنے میں آمادہ نہیں ہیں - وہ سمجھتے ہیں تقسیم ناگزیر نہیں ہے، لیکن میری رائے ہے کہ پاکستان صرف ناگزیر ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا واحد حل ہے - دوسری بات جس پر ہم نے غور کیا، ایک خط تھا جس پر ہم دونوں نے دستخط

گئے ہیں۔ اس کے ذریعے ہم نے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ امن برقرار رکھیں۔ ہم دونوں اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ اپنے اپنے میدانِ عمل میں اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اس اپیل پر عمل ہو اور اس سلسلے میں ہم بھی پوری محنت کریں۔"

۳ جون کا اعلان

برطانوی حکومت نے ۳ جون کو ہندوستان کی تقسیم اور اس کے ساتھ پنجاب اور بنگال کے بٹوارے کا بھی اعلان کر دیا۔ نہرو نے اس فیصلے کے بارے میں ریڈیو پر عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "میں جب آپ کے سامنے یہ تجویزیں رکھ رہا ہوں تو اس سے مجھے خوشی نہیں ہو رہی ہے، اگرچہ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ صحیح طریقۂ کار یہی ہے۔" ۹ جون کو گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا سبھا کے بعد ایک تحریری بیان پڑھ کر سنایا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ جب میں تقسیم کی مخالفت کرتا تھا تو اس وقت میں عوام کی خواہش کا اظہار کرتا تھا لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ عوام کا رجحان تقسیم کے حق میں ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں عوام کو اپنی ذاتی رائے کے تسلیم کرنے پر مجبور کروں۔

آخر تقسیم ہو گئی

ملک کی تقسیم کا پلان ہر طرف سے منظور کر لیا گیا اور اس کے بعد تقسیمِ اختیارات کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس موقع پر سر چمن لال سیتلواد نے ایک سیاسی پیشینگوئی کی تھی جو یہ تھی:

"ہندوستان کی تقسیم نے افرا تفری اور تنازعات کے لامتناہی سلسلوں کی بنیاد ڈال دی ہے جو آنے والی نسلوں کو ناقابلِ تصور مصیبتوں اور آفتوں میں مبتلا کر دے گی۔"

کیا جناح پاکستان چاہتے تھے؟

میں سمجھتا ہوں کہ جناح پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ سن ۱۹۴۶ تک وہ متحدہ ہندوستان کے لیے کام کرنے پر تیار تھے۔ میرے خیال میں وہ پاکستان کا مطالبہ پیش کر کے مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اگر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کانگریسی لیڈر اُن سے کوئی سمجھوتا کرنا نہیں چاہتے تھے تو اس میں حق بجانب تھے۔ جب کبھی کانگریسی رہنماؤں نے یہ دیکھا کہ برطانیہ سمجھوتے پر آمادہ ہو رہا ہے تو اُن کے ذہن میں جناح کو نظر انداز کر دینے کا خیال فوراً آجاتا تھا۔ کانگریسی لیڈروں کا کہنا تھا کہ ہندو مسلمان مسئلے کو کانگریس جناح اور مسلم لیگ نہیں بلکہ صرف کانگریس اور برطانیہ حل کر سکیں گے۔

ہندوستان تقسیم ہو گیا، بھارت اور پاکستان دو مملکتیں بن گئیں۔ جناح نے پاکستان نہیں جیتا ——— کانگریسی لیڈر، نہرو اور پٹیل، جناح کو پاکستان ہار بیٹھے!

قائدِ اعظم کی تقریر

۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے (جن کو "قائدِ اعظم" کہا جانے لگا تھا) جو تقریر کی تھی وہ آج بھی دُہرائی جانے کے قابل ہے۔ اُنھوں نے کہا تھا:

"ہم اس بنیادی اُصول کے ساتھ اپنی مملکت کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے اور برابر حیثیت کے شہری ہیں۔ انگلستان کے لوگوں نے زمانے کے ساتھ، حالات کو سمجھ لیا تھا۔ وہاں کی حکومت پر عوام نے جو ذمہ داریاں ڈالی تھیں اُنھیں پُورا کرنے

خاطر حکومت کو بہت سے اقدام کرنے پڑے تھے - آج آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں رومن کیتھولک یا پروٹسٹنٹ فرقے کا عدم اور وجود بالکل برابر ہے - وہاں کا ہر شہری 'انسان ہے اور بس - سب برابر کی حیثیت کے شہری ہیں - سب ایک قوم کے افراد ہیں - میرے خیال میں ہمیں بھی وہی نصب العین اختیار کرنا چاہیے - اس طرح وقت کے ساتھ ہندو 'ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان 'مسلمان نہیں رہیں گے —— مذہبی اعتبار سے نہیں —— کیونکہ عقیدہ یا ایمان ہر شخص کا انفرادی حق ہے —— البتہ سیاسی اعتبار سے وہ سب ایک ریاست کے شہری ہوں گے۔"

مستقبل

بھارت اور پاکستان کو ہر حال میں ایک دوسرے کا دوست بن کر رہنا ہے، نہ تو ان میں جنگ ہونی چاہیے اور نہ انھیں جنگی حالات کے قریب جانا چاہیے - بھارت اور پاکستان کی باہمی منافرت سے امنِ عالم کو خطرہ ہے - اس برِ صغیر میں امن 'صلح و آشتی کا سایہ رہنا چاہیے -

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ کو محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا - وہ مملکتِ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے، اُن کی قوم نے انھیں "قائدِ اعظم" کا شاندار خطاب دیا - دُنیا کی تاریخ میں اُن کا نام ایک نئی ریاست کے بانی کی حیثیت سے لکھا جائے گا، لیکن میرے لیے اُن کی حیثیت ایک ہمدرد اور مخلص دوست کی ہے، میں نے اُن کی رفاقت اور دوستی سے بہت کچھ سیکھا اور پایا -

اس داستان کا مصنف وُہ ہے۔

- جو ۲۲ سال تک قائداعظم محمد علی جناح کا گہرا دوست رہا
- جو برسوں اُن کے ساتھ ایک رفیق کی حیثیت سے کام کرتا رہا
- جو اُن کی پبلک اور پرائیوٹ زندگی کو اتنے قریب سے دیکھ سکا کہ کوئی اور نہ دیکھ پایا
- جو بدلے ہوئے حالات میں بھی اپنے دوستانہ تعلقات بدستور قائم رکھے رہا۔

یہ داستان نہیں، دستاویز ہے۔

(ناشر)